اور قابلِ ذکر مضامین ہیں، یہ نمبر محنت سے مرتب کیا گیا ہے اور اس کی اشاعت نے وقت کی ایک اہم اور بڑی قومی و ملی ضرورت پوری کی ہے،

دیوانِ خواجہ میر درد، مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، تقطیع خورد کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۲۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت ستے، پتہ مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی نمبر ۶،

یہ اردو کے نامور شاعر اور مشہور صوفی خواجہ میر درد کے اردو دیوان کا نیا اڈیشن ہے جس کو ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ریڈر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی نے دیوان کے کئی مطبوعہ اور قلمی نسخوں اور متعدد تذکروں کی مدد سے مرتب کیا ہے، حاشیہ میں انھوں نے مختلف نسخوں کے اختلافات کی تصریح کر دی ہے، غزلیں حروف تہجی کی ترتیب سے دی گئی ہیں، آخر میں فردیات، قطعات، رباعیات، ترکیب بند اور مخمس وغیرہ شامل ہیں، شروع میں ڈاکٹر صاحب کے قلم سے ایک پر مغز اور قابلِ مطالعہ مقدمہ ہے، اس میں خواجہ صاحب کی شخصیت، شاعری اور تصوف پر بڑے اعتدال و توازن کے ساتھ سنجیدہ بحث کی گئی ہے اور آخر میں نامانوس اور غریب الفاظ کے فرہنگ دیئے گئے ہیں، دیوان درد کے اب تک جو اڈیشن چھپے ہیں ان میں یہ سب سے جامع اور درد کی شاعری اور تصوف کے بارہ میں مفید معلومات پر مشتمل ہے

اردو کے حروفِ تہجی، مرتبہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۹۶ قیمت ۶/ پیسے پتہ: ادارۂ المخدوم، ڈاکخانہ تندا اور ضلع گڑھ۔ اندھرا پردیش،

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نوجوان اور لائق اہل قلم ہیں، مخطوطات اور غالبیات وغیرہ پر ان کے بعض محققانہ مضامین نے اصحاب علم و نظر کو ان کی جانب متوجہ کر دیا ہے، اس مختصر رسالہ میں اردو کے حروف تہجی کے عہد بعہد ارتقاء کا ذکر اب تک ان کے سلسلہ میں ہونے والی اصلاح و ترمیم کا جائزہ، انکی وضع و ایجاد کے مواقع اور اردو کے فارسی رسم الخط اختیار کرنے کے وجوہ و نتائج وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، مصنف نے رسم الخط کی اصلاح کے سلسلہ میں مماثل و متقارب الصوت حرفوں کو ترک کرنے کی رائے کی شدت سے مخالفت کی ہے، آخر میں اس موضوع کے متعلق بیز اردو میں تغیر کے چند دستہ ایک مفید رسالہ کا ضروری حصہ بھی مختصر تعارف کے ساتھ شامل کیا گیا ہے، یہ کتابچہ ٹھوس معلومات پر مشتمل ہے،

(ض)

جلد ۱۱۱۔ ماہ محرم الحرام ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۳ء۔ عدد ۲

مضامین

شذرات

آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر سید عبدالرحمٰن باقفیہ تھنگل مرحوم کی وفات قومی وملی حادثہ ہے، اور ان کی موت اس لحاظ سے ہر مسلمان کے لیے قابل رشک ہو کر حج سے فراغت کے بعد وہ سعودی عربیہ کے دار الحکومت ریاض گئے تھے، وہیں ایک مختصر علالت کے بعد انتقال کیا، حرم محترم میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور مکہ معظمہ کی سرزمین میں سپرد خاک کیے گئے، اس طرح گناہوں سے پاک و صاف ہو کر لبیک کہتے ہوئے اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گئے،

خوش حال آنکہ دید ترا و سپرد جان آگہ نشد کہ ہجر کدام و وصال چیست

تھنگل مرحوم اگرچہ مسلم لیگ کے صدر تھے لیکن ملکی، قومی خدمات میں بھی انکا قدم پیچھے نہ تھا، اس لیے بلا تفریق مذہب وملت سب ان کو مانتے تھے، اور انکی موت پر جنوبی ہند کے ہندو مسلمان دونوں نے یکساں ماتم اور ان کی موت کو قومی نقصان تصور کیا، ارض مقدس میں ان کی موت خود مغفرت کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔

دوسرا حادثہ غلام احمد فرقت کاکوروی مرحوم کی دردناک موت کا ہے، انھوں نے عالم مسافرت میں بڑی بیکسی میں جان دی، بہار کے کسی مشاعرے سے واپس آرہے تھے کہ راستہ میں دفعتہً انتقال ہو گیا، مغل سرائے اسٹیشن پر ٹرین میں لاش ملی، ڈائری سے مرحوم کے نام کا پتہ چلا، پولیس نے ضروری کارروائی کے بعد لاش بنارس کی ایک اسلامی انجمن کے حوالہ کردی جس نے اس مشہور ادیب کو لاوارثی میں

دفن کیا، اس دردناک حادثہ پر جتنا بھی رنج والم کا اظہار کیا جائے کم ہے،

فرقت مرحوم فطری ظریف اور طنز و ظرافت میں شوکت تھانوی کا مثنیٰ تھے، مگر ان کی ظرافت محض ہنسنے ہنسانے کا سامان نہ تھی، بلکہ اکبر کی شاعری کی طرح اصلاحی بھی، اور اس سے انھوں نے بڑے مفید کام لیے، اور اس دور کے ادبی اور سماجی فتنوں کا اپنے رنگ میں بھرپور مقابلہ کیا، اس لحاظ سے وہ ادیب نہ تھے، ان کے قلم میں اتنی طاقت تھی اور انداز بیان اتنا دلکش اور موثر تھا کہ ان کے حریف بھی ان کا لوہا مانتے تھے، وہ ان کے طنز پر تڑپ اٹھتے تھے، مگر اس سے لطف لینے پر بھی مجبور تھے، ان کو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر بھی پوری قدرت تھی، اور لکھنؤ کی پرانی سوسائٹی کی مصوری میں بھی کمال حاصل تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مسافرت کی موت اور اصلاحی خدمات کے صلہ میں ان کی مغفرت فرمائے،

متبنیٰ بنانے کا قانون جو پہلے ہندوؤں کے لیے مخصوص تھا، اب حکومت اسکو سب کے لیے عام کرنا چاہتی ہے، مگر یہ قانون مختلف حیثیتوں سے اسلامی قوانین سے متصادم ہے، اس لیے مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کو اس سے مستثنیٰ رکھا جائے، اسلیے حکومت ہند اس مسئلہ میں مسلمان علماء کے بیانات لے رہی ہے، اور جو لوگ کسی معذوری سے زبانی بیان دینے کے لیے نہیں جاسکتے ان کی تحریری رائیں مانگی ہیں، راقم کے پاس بھی دعوت نامہ آیا تھا، جس کا مفصل جواب بھیجدیا گیا۔

تبنیت کے قانون کی رو سے متبنیٰ لڑکا متبنیٰ بنانے والے کا حقیقی اور صلبی لڑکا تصور کیا جاتا ہے، اور اس کو وہ سارے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو صلبی لڑکے کے ہوتے ہیں، اور اپنے اصل والدین سے اس کا کوئی تعلق اور ان پر اس کا کوئی حق نہیں رہ جاتا، اس کا اثر اسلام کے پورے نظامِ وراثت اور شادی بیاہ کے رشتوں پر پڑتا ہے، متبنیٰ لڑکا اپنے والدین کی وراثت سے جس کا اسلام نے اس کو وارث بنایا ہے، محروم ہو جاتا ہے، اور جس کی وراثت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے، اس کا وارث بنجاتا ہے، اس کا اثر دونوں کے دوسرے ورثہ کی وراثت پر بھی پڑتا ہے، متبنیٰ بنانے والے کے سارے ورثہ اس کی وراثت سے محروم ہو جاتے ہیں، یا ان کا حصہ گھٹ جاتا ہے، اور اصلی والدین کے ورثہ کا حصہ بڑھ جاتا ہے، اس طریقہ سے جن عورتوں سے متبنیٰ کی شادی جائز تھی، ان سے حرام ہو جاتی ہے، ممکن ہے بعض ایسی عورتوں سے جائز ہو جاتی ہو جس سے اسلام میں حرام ہے، اسکے علاوہ اسلام نے اپنے والدین کے علاوہ کسی دوسرے کیجانب نسب کا انتساب حرام قرار دیا ہے، حدیثوں میں اس پر سخت وعیدیں آئی ہیں، قرآن مجید نے بھی اس کی تردید کی ہے،

اسلام میں وراثت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ مشکل ہی سے کوئی مسلمان ایسا نکل سکتا ہے جس کا کوئی نہ کوئی شرعی وارث موجود نہ ہو، اور اگر بالفرض لاکھوں میں ایسی کوئی مثال مل جائے تو ہبہ وقف اور وصیت کا دروازہ کھلا ہوا ہے، راقم کو پورا علم تو نہیں ہے، لیکن شاید ہندوں میں متوفی کی نجات کے لیے اس کی اولاد کا بعض مذہبی رسوم ادا کرنا ضروری ہے، اس لیے لاولد کے لیے ان میں متبنیٰ بنانے کا دستور ہو، مگر مسلمانوں میں اس قسم کا کوئی تصور نہیں ہے، اسلام میں نجات کا دارومدار ذاتی عمل پر ہے، باقی دعائے مغفرت ہر مسلمان کر سکتا ہے، اس لیے مسلمانوں کو کسی کو متبنیٰ بنانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

مقالات

ہندوستان میں علم حدیث اموی دور تک

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

اخبرنا و حدثنا کا دور اور یہاں کے محدثین

اس کے بعد جب دوسری صدی میں احادیث کے مجموعے اور صحیفے مدون ہوئے اور ان کی روایت کا سلسلہ شروع ہوا تو ہندوستان کی فضا بھی "اخبرنا، حدثنا" کے ترانوں سے گونج اٹھی، اس دور میں ارمائیل، دیبل، منصورہ اور ملتان وغیرہ مسلمانوں کے مرکز تھے، جہاں ان کی بڑی بڑی آبادیاں اور مساجد اور جوامع تھیں، قضا و خطابت کا باقاعدہ انتظام تھا، اور پورے عالم اسلام کی طرح ہندوستان کے ان اسلامی شہروں میں دینی و اسلامی زندگی برپا تھی، اور ان میں علومِ اسلامیہ کی تعلیم ہو رہی تھی، احادیث و سنن کی روایت کا سلسلہ قائم تھا، اور یہاں سے علماء و محدثین کے تعلیمی سفر جاری تھے، اس دور میں بہت سے ہندی الاصل مسلمان عرب اور دوسرے بلادِ اسلامیہ میں حدیث و روایت کے امام ہوئے، اور یہاں کے کئی عربی الاصل مسلمانوں نے عرب وغیرہ جاکر علم حدیث میں خاص مقام و مرتبہ حاصل کیا۔

ہماری تحقیق میں اموی دور میں ہندوستان کا شہر دیبل علم حدیث کا اہم مرکز بن گیا تھا،

اور کئی صدیوں تک یہاں علم و فضل اور علماء و فضلاء کا چرچا رہا، اسی ملک میں سب سے پہلے اسی شہر میں باقاعدہ روایتِ حدیث کا سلسلہ جاری ہوا، اور یہاں سے طلبِ حدیث کے لیے عرب کا سفر ہوا،

(۱) یہاں کے محدثین میں سب سے پہلا نام شیخ عبد الرحیم بن حماد ثقفی دیبلیؒ کا ملتا ہے، محمد بن قاسم کی فتوحات کے زمانہ میں قبیلۂ ثقیف کا جو خاندان دیبل میں آباد ہو گیا تھا، اسی سے شیخ عبد الرحیم بن حماد کا نسبی تعلق تھا، وہ اپنے زمانہ کے مشہور محدث اور عابد و زاہد بزرگ تھے، پھر یہاں سے بصرہ کا سفر کیا تھا، ان کے بارے میں امام عقیلی کے دادا کا بیان ہے :-

قدم علینا من السند شیخ کبیر	ہمارے یہاں بصرہ میں سندھ سے ایک بڑے
کان یحدث عن الاعمش	عالم آئے جو امام اعمش اور عمرو بن عبید
وعمرو وعبید[1]	سے روایت کرتے تھے،

امام اعمش کی وفات ۱۴۸ھ میں ہوئی، اور مفتی معتزلہ عمرو بن عبید کا انتقال ۱۴۲ھ یا ۱۴۴ھ میں ہوا، اور شیخ عبد الرحیم دیبلی نے ان دونوں سے روایت کی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسری صدی کے ربع اول میں یہ دیبلی محدث بصرہ میں اخبرنا، حدثنا کی بزم سجائے ہوئے تھے، اور ان سے اہل عراق نے روایت کی،

(۲) اسی زمانہ میں سندھ میں ایک محدث قیس بن بسر بن سندی تھے، جن سے محمد بن عزاز بن اوس (جُبَیل) نے روایت کی ہے، امام ابن ماکولا نے الاکمال میں قیس بن بسر بن سندی کے ذکر میں لکھا ہے،

وذکر انہ سمع منہ جُبَیل	بیان کیا گیا ہے کہ قیس بن بسر سے جبیل نے

[1] لسان المیزان، ج ۶ ص ۵۱۸

جبیل کو ۱۳۰ھ میں سندھ میں غلبہ حاصل کرنے کے بعد منصور بن جمہور کلبی نے قتل کیا تھا، ابن ماکولا ہی نے لکھا ہے :-

قتل منصور بن جمہور جبیل	محمد بن عزاز المعروف بہ جبیل کو منصور بن
وھو محمد بن عزاز بن اوس بالسند[1]	جمہور نے سندھ میں قتل کیا،

اس کا مطلب یہ ہے کہ جبیل نے قیس بن بسر بن سندی سے دوسری صدی کے ربع اول میں سندھ میں حدیث کا سماع کیا ہوگا، قیس بن بسر سندی نے ہشام بن عمار سے اور ان سے جبیل کے علاوہ ابوبکر بن شاذان نے روایت کی ہے،

(۳) اس دور کے سندھی محدثین میں شیخ یزید بن عبد اللہ قرشی بیسری سندھی بصری مشہور محدث تھے، جنھوں نے یہاں سے بصرہ جا کر واقدی، ابن جریج اور امام سفیان ثوری وغیرہ سے روایت کی، اور ان سے علی بن ابو ہاشم طبری قواریری، ابوداؤد طیالسی، محمد بن ابوبکر مقدمی اور محدثین کی ایک جماعت نے روایت کی ہے،[2]

(۴) ایک اور محدث سندی بن شماس بصری تھے، جنھوں نے سندھ سے بصرہ جا کر امام ابن سیرین اور امام عطاء وغیرہ سے روایت کی، اور ان سے موسیٰ بن اسمٰعیل نے روایت کی۔[3]

(۵) عبد الرحمٰن بن سندھی بھی دوسری صدی کے سندھی محدثین میں تھے، انھوں نے عراک بن خالد دمشقی سے روایت کی ہے،[4]

(۶) موسیٰ سیلانی اس دور کے اکابر علماء میں تھے، ان کا تعلق سیلون (سرندیپ)

[1] الاکمال ج ۱ ص ۲۷۲ اور ج ۲ ص ۵۶۵ [2] التاریخ الکبیر ج ۲ ق ۲ ص ۱۱۷، وکتاب الجرح والتعدیل ج ۲ ق ۱ ص ۳۱۸ [3] کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ ق ۳ ص ۲۷۱ ولسان المیزان ج ۶ ص ۲۹۰ [4] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۷۱

سے تھا، تابعی ہیں اور انھوں نے براہ راست حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے استفادہ کیا ہے[1]،

(۷) اموی دور کے رواۃ حدیث میں ایک بزرگ عبدالرحمٰن سندی تھے، انھوں نے بھی حضرت انس بن مالکؓ سے سماع کیا ہے، اور ان کی صحبت اٹھائی ہے[2]،

(۸) ابو شیخ بن حماد ہندی بھی اس دور کے عالم حدیث ہیں، انھوں نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے، اور ان سے بیہس بن فہدان نے روایت کی ہے، (کتاب الثقات ص ۳۰۳) ان حضرات کے حالات کے لیے طبقات الرجال کی کتابیں ملاحظہ ہوں یا پھر ہماری کتاب "العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین" ملاحظہ کی جائے،

یہاں آنے والے رواۃ حدیث اور محدثین: ذیل میں ہم ان چند مشہور رواۃ حدیث و محدثین کے نام درج کرتے ہیں جو اموی دور خلافت میں غزوات و امارات اور دوسرے امور میں وقتاً فوقتاً ہندوستان آئے، اور ان کی مرویات کتابوں میں پائی جاتی ہیں، یہ حضرات یہاں آکر اپنی محفوظات یا مدونات کو موقع بہ موقع بیان کرتے رہے، اور ان کی ذات سے یہاں احادیث کی روایت کا سلسلہ جاری ہوا، ان کے مفصل حالات کے لیے طبقات و رجال کی کتابیں دیکھی جائیں، یا پھر ہماری کتاب العقد الثمین کا مطالعہ کیا جائے،

(۱) سنان بن سلمہ بن ہذلی رضی اللہ عنہ، صحابی ہیں، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسل حدیث روایت کی ہے، اور اپنے والد حضرت سلمہ بن محبق ہذلی، حضرت عمرؓ، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایتیں کی ہیں، اور ان سے سلم ابن جنادہ، معاذ بن سعوہ، ابو عبدالصمد حبیب اور ہارون بن رباب اسیدی نے روایت

---

[1] مقدمہ ابن صلاح ص ۱۴۷ و کتاب الجرح والتعدیل ج ۳ ق ۱ ص ۱۶۹ [2] التاریخ الکبیر ج ۳ ص ۲۹۵

کی ہے، حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں متعدد بار ہندوستان تشریف لائے تھے،

(۲) عمر بن عبید اللہ بن معمر قرشی تیمیؒ نے ابان بن عثمان سے، اور ان سے نبیہ بن وہب نے روایت کی ہے، خلیفہ بن خیاط نے ان کو قضاۃ اسلام میں شمار کیا ہے،

(۳) مہلب بن ابو صفرہ ازدی نے عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، براء بن عازب رضی اللہ عنہم سے اور ان سے سماک بن حرب، ابو اسحٰق سبیعی، عمر بن ثقیف نے روایت کی ہے، سنن کی کتابوں میں ان کی متعدد مرویات موجود ہیں،

(۴) کرز بن ابو کرز دبرہ حارثیؒ نے نعیم بن ابو ہند، طاؤس، عطاء بن ابو رباح، ربیع بن خثیم قرظی، اور دیگر علمائے تابعین سے روایت کی ہے، اور ان سے سفیان ثوری، قاضی ابن شبرمہ، عبید اللہ وصافی، فضیل بن غزوان، ورقاء بن عمر نے روایت کی ہے، ان سے مرسل احادیث بھی مروی ہیں، اپنے زمانہ کے مشہور عباد و زہاد میں سے ہیں

(۵) ابو الیمان معلی بن راشد نبال ہذلی نے اپنی دادی ام عاصم نبیشہ، اپنے والد راشد اور میمون بن سیاہ، حسن بصری، زیاد بن میمون ثقفی سے روایت کی، اور ان سے یزید بن ہارون، عبید اللہ بن صالح عجلی، روح بن عبد المومن، ابو بشر ابن بکر بن خلف اور نصر بن جہضمی نے روایت کی ہے، بصرہ کے مشہور عابد و زاہد اور محدث ہیں،

(۶) عبادؒ بن زیاد بن ابو سفیان نے عروہ بن مغیرہ بن شعبہ، اور ان کے بھائی ضمرہ سے روایت کی، اور ان سے امام زہری اور امام مکحول شامی نے روایت کی ہے،

(۷) سعید بن اسلم بن زرعہ کلابیؒ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور بنی غفار کے

کے موالی سے روایت کی اور ان سے عبداللہ بن بریدہ نے روایت کی ہے، ایک قول
کے مطابق انھوں نے بکیر بن اشج سے سماع کیا ہے، ان کا شمار قضاۃ اسلام میں ہے،

(۸) معاویہ بن قرہ بن ایاس مزنیؒ نہایت ثقہ محدث اور مشہور تابعی قاضئ اسلام
ایاس بن معاویہ کے والد ہیں، انھوں نے اپنے والد قرہ بن ایاس، حضرت معقل بن یسار،
حضرت ابوایوب انصاری، حضرت حکم بن ابوالعاص ثقفی، حضرت عبداللہ بن مغفل
رضی اللہ عنہم کے علاوہ کئی علماء سے روایت کی ہے، اور ان سے ان کے صاحبزادے
ایاس بن معاویہ، پوتے مستنیر بن اخضر بن معاویہ، اور امام زہری، ابراہیم بن محمد،
اسحٰق بن یحییٰ بن طلحہ، حسن بن زید بن حسن بن علی وغیرہ نے روایت کی ہے، معاویہ بن قرہ
اور ان کے شیخ حکم بن ابوالعاص دونوں اپنے اپنے زمانہ میں ہندوستان آئے ہیں،

(۹) کہمس بن حسن قیسیؒ بصرہ کے عُبّاد و زہاد میں نہایت ثقہ محدث ہیں، انھوں نے
ابوالطفیل عبداللہ بن بریدہ، عبداللہ بن شقیق، عباس جریری، ابوالسلیل ضریب
ابن نفیر، یزید بن عبداللہ بن شخیر، سیّار بن منظور، ابونضر عبدی وغیرہ سے روایت کی
ہے، اور ان سے ان کے صاحبزادے عون بن کہمس، خالد بن حارث، معاذ بن معاذ،
وکیع بن جراح، نضر بن شمیل، قطان، عبداللہ بن مبارک، معتمر بن سلیمان، سفیان بن
حبیب، یوسف بن یعقوب سدوسی، جعفر بن سلیمان، عثمان بن عمرو، علی بن مذاب،
ابواسامہ، یزید بن ہارون، عبداللہ بن یزید مقری وغیرہ نے روایت کی ہے،

(۱۰) زائدہ بن عمیر طائیؒ نے عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو،
جابر بن عبداللہ، نعمان بن بشیر، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے، اور ان سے امام
شعبہ، اور یونس بن ابواسحٰق نے روایت کی ہے،

(۱۱) عطیہ بن سعد بن جنادہ عوفیؒ نے ابوہریرہ، ابوسعید خدری، ابن عباس
رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے، اور ان سے ان کے دونوں صاحبزادوں عمر بن عطیہ
اور حسن بن عطیہ نے روایت کی ہے،

(۱۲) موسیٰ بن سنان بن سلمہ ہذلیؒ نے عمران بن حصین، ابوہریرہ، ابوبکرہ، ابوبرزہ،
معقل بن یسار، عبداللہ بن معقل، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک
رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے، اور ان سے ان کے صاحبزادے مثنی بن موسیٰ کے علاوہ
قتادہ اور ابوالتیاح نے روایت کی ہے، موسیٰ بن سنان ہذلی قلیل الحدیث تابعی ہیں،

(۱۳) حکم بن عوانہ کلبیؒ کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے لسان المیزان میں لکھا ہے کہ
وہ حضرات تابعین سے کثیر الروایہ ہیں،

(۱۴) مجاعہ بن سعر تمیمی کو خلیفہ بن خیاط نے قضاۃ اسلام میں شمار کیا ہے،

(۱۵) محمد بن ہارون بن ذراع نمیریؒ کو بھی خلیفہ بن خیاط نے قضاۃ اسلام میں شمار
کیا ہے،

(۱۶) ابوقیس زیاد بن رباح قیسیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے اور ان سے حسن بصری
اور غیلان بن جریر نے روایت کی ہے،

(۱۷) قیس بن ثعلبہؒ نے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود
رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے، اور ان سے اہل کوفہ نے روایت کی ہے، ان کا شمار
علمائے کوفہ میں ہے،

(۱۸) جنید بن عمرو عدوانی مکی مقریؒ نے حمید بن قیس الاعرج سے روایت
کی ہے،

(۱۹) شمر بن عطیہ اسدیؒ نے وائل بن ربیعہ اور زرؒ سے، اور ان سے امام اعمش اور قیس ابن ربیعہ نے روایت کی ہے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ ولہ احادیث صادقۃ نیز امام نسائیؒ نے ان کی توثیق کی ہے،

(۲۰) محمد بن زید عبدیؒ نے شہر بن حوشب سے اور ان سے محمد بن ابراہیم باہلی نے روایت کی ہے،

(۲۱) ابوشیبہ جوہریؒ کا نام یوسف بن ابراہیم تمیمی ہے، انھوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور ان سے عقبہ بن خالد اور مسلم بن قتیبہ نے روایت کی ہے،

(۲۲) زید بن حواری عمی نے حضرت انسؓ، حسن بصری، معاویہ بن قرہ وغیرہ سے روایت کی ہے، اور ان سے امام اعمش، ابواسحٰق سبیعی، محمد بن فضیل بن عطیہ، اور سلام الطویل نے روایت کی ہے، ابن سعد نے ان کو ضعیف فی الحدیث لکھا ہے،

(۲۳) یزید بن ابوکبشہ سکسکیؒ نے اپنے والد ابوکبشہ جبریل بن یسار، مروان بن حکم اور ایک صحابی سے روایت کی ہے، اور ان سے ابوبشر، حکم بن عتبہ، علی بن الاقمر، معاویہ بن قرہ مزنی، ابراہیم بن عبدالرحمٰن سکسکی وغیرہ نے روایت کی ہے، صحیح بخاری کتاب الجہاد میں سفر میں روزہ رکھنے کے بارے میں ان سے روایت موجود ہے،

(۲۴) عمران بن نعمان کلبیؒ نے ربیع بن بسرہ سے احادیث کا سماع کیا اور ان سے عبداللہ بن مبارک نے سماع کیا ہے،

(۲۵) ہلال بن اخوز مازنیؒ نے حضرت سوید بن مقرن رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے،

(۲۶) مفضل بن مہلب ازدی نے حضرت نعمان بن بشیرؓ سے اور ان سے ان کے صاحبزادے حاجب بن مفضل نے روایت کی ہے،

(۲۷) ابوعینیہ بن مہلب ازدیؒ نے امام اعمش سے، اور ان سے ان کے صاحبزادے محمد بن ابوعینیہ نے روایت کی ہے،

(۲۸) محمد بن غزان کلبیؒ نے امام اوزاعی اور عمر بن محمد سے روایت کی ہے، محدثین نے ان کو منکر الحدیث بتایا ہے،

(۲۹) منصور بن جمہور کلبیؒ نے دحیہ سے اور ان سے مرثد بن عبداللہ یزنی نے روایت کی ہے،

(۳۰) ابوالحسن معلی بن زیاد بن حاضر قردوسی بصریؒ نے امام حسن بصری، حنظلہ سدوسی، معاویہ بن قرہ، علاء بن بشر، مرہ بن دثاب، ابوغالب صاحب ابی امامہ، حسین جعفی، معاویہ بن معاویہ، ثابت بنانی، وغیرہ سے روایت کی ہے، اور ان سے ہشام بن حسان، حماد بن زید، جعفر بن سلیمان، یوسف بن عطیہ الصفار، سعید بن عامر ضبعی وغیرہ نے روایت کی ہے، ان کا شمار بصرہ کے عباد و زہاد میں ہے،

مذکورہ بزرگ اموی دور میں ہندوستان آئے اور ان کا شمار رواۃ حدیث اور محدثین میں ہے، ان میں کئی بزرگ مشہور ائمۂ حدیث ہیں، انھوں نے یہاں ایک خاص مدت تک قیام کیا، اور اس دور کے طریقہ کے مطابق دوران قیام میں اپنی روایات بیان کیں،

عرب کے ہندی الاصل محدثین

جس زمانہ میں عرب کے یہ رواۃ حدیث اور محدثین ہندوستان میں احادیث وسنن کی تعلیم وتلقین اور روایت میں مصروف تھے، خود ہندوستان کے کئی خانوادے اور افراد عرب میں اس کی روایت میں مشغول تھے، ذیل میں ہم ایسے

ہندی الاصل علمی و دینی خانوادوں اور ان کے علماء و رواۃ کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں، جو اموی دور خلافت میں عالم اسلام کے مشرقی مطلع پر روشن ہوئے،

آل بیلمانی محدثین کا یہ خاندان مقام بھیلمان (سوراشٹر) سے عرب پہنچا، غالباً یہ لوگ پہلے یمن کے علاقہ نجران میں آباد تھے، اور یہیں سے خلافت راشدہ کے زمانہ میں کسی غزوہ میں گرفتار کرکے مدینہ منورہ لیجائے گئے، اور حضرت عمرؓ کے حصہ میں آئے، اسی لیے ان کو "مولیٰ عمر" اور "مولیٰ آل عمر" کہتے ہیں، اموی دور میں خانوادہ آل بیلمانی میں متعدد رواۃ و محدثین اور اہل علم و فن گذرے ہیں، رجال و طبقات کی کتابوں میں ان کے حالات موجود ہیں، جن میں حسب ذیل حضرات کے نام اور حالات معلوم ہوسکے ہیں،

(۱) عبد الرحمٰن بن ابو زید بیلمانیؒ نے حضرت عثمانؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ ابن عمروؓ اور سعید بن زید، معاویہ، عمرو بن اوس، عمرو بن عبسہ، سرق، نافع بن جبیر ابن مطعم، عبد الرحمٰن الاعرج وغیرہ سے روایت کی، اور ان سے ان کے صاحبزادے محمد بن عبد الرحمٰن بیلمانی، یزید بن طلق، ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن، خالد بن ابی عمران، سماک بن فضل اور امام عبد الرزاق صنعانی کے والد ہمام کے علاوہ محدثین کی ایک جماعت نے روایت کی ہے، ان سے عمرو بن عبسہ کے اسلام لانے کی روایت جامع ترمذی اور سنن نسائی میں موجود ہے، محدثین نے ان کی ثقاہت میں کلام کیا ہے، عبد الرحمٰن بیلمانی عربی کے شاعر بھی تھے، ان کے حالات طبقات ابن سعد، تہذیب التہذیب اور کتاب الجرح والتعدیل وغیرہ میں ہیں،

(۲) محمد بن عبد الرحمٰن بن ابو زید بیلمانی نے اپنے والد اور ان کے ماموں سے روایت کی ہے، اور ان سے سعید بن بشیر بخاری، عبید اللہ بن عباس بن ربیع حارثی

محمد بن زیاد حارثی، محمد بن کثیر عبدی، ابو سلمہ موسیٰ بن اسمٰعیل وغیرہ نے روایت کی ہے، محدثین کے نزدیک ان کی روایات غیر معتبر ہیں، وہ علم نحو کے بھی عالم تھے، تہذیب التہذیب میں ان کے حالات موجود ہیں،

(۳) حارث بیلمانیؒ نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے، اور ان سے ان کے صاحبزادے محمد بن حارث نے روایت کی ہے،

(۴) محمد بن حارث بیلمانیؒ نے اپنے والد کے واسطے سے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے اور محمد بن حارث حارثی کے واسطے سے محمد بن عبد الرحمٰن بیلمانی سے روایت کی ہے،

(تہذیب التہذیب)

(۵) محمد بن ابراہیم بیلمانی سے عبید اللہ بن ربیع نجرانی نے روایت کی ہے،

یہ تمام خانوادہ آل بیلمانی کے رواۃ حدیث اموی دور خلافت میں عراق وغیرہ میں موجود تھے،

آل مقسم قیقانی اموی دور میں ہندوستان کا ایک اور خاندان عراق میں علم حدیث میں ابھرا، جس میں صدیوں نامور علماء و محدثین اور ارباب جاہ و حشم پیدا ہوتے رہے، یہ مقسم قیقانی کا خاندان ہے، ابن سعد نے طبقات میں تصریح کی ہے

وکان مقسم من سبی القیقانیۃ — مقسم قیقان کے قیدیوں میں سے تھے،

ما بین خراسان و زابلستان — جو کہ خراسان اور زابلستان کے درمیان واقع ہے

قیقان سندھ کا مشہور شہر اور علاقہ تھا، جو کیکان (قلات ڈویژن) کا معرب ہے،

قیقان سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت حارث بن مرہ عبدیؒ کی امارت و قیادت میں فتح ہوا، اور بہت سے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے، اغلب یہ ہے کہ مقسم قیقانی ان ہی قیدیوں میں تھے، عراق میں ان کی نسل سے علماء و محدثین پیدا ہوئے،

یہ خاندان کوفہ میں قبیلہ اسد بن خزیمہ کی ولاء اور غلامی میں رہا، اور مقسم قیقانی عبد الرحمن ابن قطبہ اسدی کے آزاد کردہ غلام تھے، اس خانوادہ میں حسب ذیل علماء مشہور ہیں:

(۱) ابراہیم بن مقسم قیقانیؒ کوفہ سے بسلسلۂ تجارت بصرہ جایا کرتے تھے اور وہیں قبیلہ بنی شیبان کی ایک آزاد کردہ باندی علیہ بنت حسان سے اس کی بیوگی کے بعد شادی کرلی، یہ بڑی عاقلہ، فاضلہ اور صاحبِ بصیرت عورت تھی، اس کا مکان بصرہ کے مقام عوقہ میں اسی کے نام سے مشہور تھا، علیہ بنت حسان کے یہاں شیخ صالح مُرّی اور بصرہ کے دوسرے اعیان و اشراف اور علماء و فقہاء آتے جاتے تھے، اور ان میں علمی گفتگوئیں ہوا کرتی تھیں،

(۲) ابو بشر اسمٰعیل بن ابراہیم قیقانیؒ ۱۱۰ھ میں علیہ کے بطن سے پیدا ہوئے، اور ماں کے ساتھ بصرہ ہی میں رہے، ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ اسمٰعیل حجت و ثقہ ہیں اور بصرہ میں حکومتِ وقت کی طرف سے صدقات کے عامل مقرر کیے گئے تھے. پھر ہارون رشید کے آخری زمانہ میں بغداد کے امیر عدل ہوئے، اور وہیں ذیقعدہ ۱۹۳ھ کو انتقال کیا،

(۳) ربعی بن ابراہیم قیقانیؒ اپنے بھائی اسمٰعیل سے چھوٹے تھے، یہ بھی علیہ کے بطن سے تھے. اور غالباً بصرہ میں سکونت پذیر رہے،

(۴) ابراہیم بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مقسم قیقانیؒ اپنے والد کے ساتھ مستقل طور سے بغداد میں رہتے تھے اور ان کی نماز جنازہ بھی ابراہیم ہی نے پڑھائی، حالانکہ اس دن بغداد میں امام وکیع بن جراح جیسے بزرگ موجود تھے، ان سب کے حالات طبقات ابن سعد میں ابراہیم بن مقسم کے ذکر میں ہیں،

آلِ ابی معشر سندھی

اسی زمانہ میں ہندوستان کا ایک اور علمی و دینی خانوادہ آلِ ابو معشر نجیح بن عبد الرحمن سندی مدنیؒ مدینہ منورہ میں تھا، یہ لوگ مولیٰ بنی ہاشم کہلاتے تھے، کیونکہ ان کے مورث اعلیٰ سندھ سے گرفتار ہو کر عرب لیجائے گئے اور بنی ہاشم کی ولاء میں رہے، جو بڑے شرف کی بات تھی، اس خاندان میں مدتوں علماء و محدثین اور حفاظ حدیث پیدا ہوتے رہے، اور ان کی تصانیف بھی ہیں، ان میں یہ علماء قابلِ ذکر ہیں:-

(۱) ابو معشر نجیح بن عبد الرحمن سندی مدنیؒ حفاظ حدیث میں سے ہیں، سیر و مغازی اور تفسیر کے متبحر عالم تھے. ان کی تصنیف کتاب المغازی بہت مشہور ہے، انھوں نے حضرت ابو امامہ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کی زیارت اور محمد بن کعب قرظی، نافع مولیٰ ابن عمر، سعید مقبری، محمد بن منکدر، ہشام بن عروہ سے روایت کی ہے. اور ان سے ان کے صاحبزادے محمد بن ابو معشر نجیح سندی، یزید بن ہارون، محمد بن عمر واقدی، اسحاق بن عیسیٰ الطباع، محمد بن بکار بن ریان، لیث بن ثور، سفیان ثوری اور عبد الرحمن بن مہدی کے علاوہ محدثین کی ایک جماعت نے روایت کی ہے،

(۲) ابو عبد الملک محمد بن ابی معشر نجیح بن عبد الرحمن سندی مدنیؒ نے اپنے والد سے ان کی کتاب المغازی کا سماع کیا تھا، اور نصر بن منصور عنزی، اور ابو الفرج الضاری سے روایت کی ہے، انھوں نے امام ابن ابی ذئب اور امام ابو بکر ہذلی کی زیارت کی تھی، ان سے ان کے دونوں صاحبزادوں داؤد اور حسین نیز ابو حاتم رازی، محمد بن لیث جوہری، ابو یعلیٰ موصلی، محمد بن جریر طبری، ابو حامد

حضرمی وغیرہ نے روایت کی ہے۔

(۳) ابوسلیمان داؤد بن محمد بن ابو معشر نجیح سندھیؒ نے اپنے والد سے اپنے دادا کی کتاب المغازی کی روایت کی، اور ان سے اس کی روایت قاضی احمد ابن کامل نے کی۔

(۴) ابوبکر حسین بن محمد بن ابو معشر نجیح سندھیؒ نے اپنے والد اور امام وکیع ابن جراح اور محمد بن ربیعہ سے روایت کی، اور ان سے محمد بن احمد حکیمی، اسمٰعیل بن محمد الصفار، علی بن اسحاق ماذرائی، ابو عمرو بن سماک اور عثمان بن احمد دقاق نے روایت کی ہے۔

اس خانوادہ کے پہلے عالم ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن نے اموی دور پایا، باقی حضرات عباسی دور میں تھے،

کیا اسلامی قانون رومی قانون کا مرہونِ منت ہے

(پروفیسر فنٹر جیرالڈ)

(ترجمہ پروفیسر محمد حمید اللہ، پارس)

(۲)

(۱۳) سادہ حقیقت یہ ہے کہ جسٹی نین کے دورِ حکومت میں بھی، اور بعد کے زمانوں میں بھی، رومی قانون [بیزنطینی سلطنت میں] ایک اجنبی قانون کی حیثیت رکھتا تھا، جو ــ تازہ ترین ترمیموں کو مستثنیٰ کرکے اگر دیکھیں تو وہ لکھا بھی جاتا تھا، ایک اجنبی [یعنی لاطینی] زبان میں، [بیزنطینی سرکاری یعنی یونانی زبان میں نہیں]۔ [ایشیائی اور افریقی] صوبہ جات میں لوگ یہ لاطینی زبان نہیں جانتے تھے، اور اس قانون کا نفاذ جو افسر کرتے تھے، ان کے لیے متعین ہونے کے مقام کا باشندہ ہونا ضروری نہ تھا ــ جو خاص افراد کی حد تک بعض وقت ہو سکتا ہے ــ بلکہ ایک ایسے شہنشاہی اقتدار کے نمائندوں کی حیثیت سے جو بہت دور تھا اور تقریباً بالکل اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا، رومی قانون ایک ایسا رازِ نہاں تھا جس سے شہر بیزنطہ [قسطنطنیہ] ہی میں طویل عرصے کی تعلیم کے بعد واقفیت حاصل ہو سکتی تھی، اس صورت حال کے تین سبب تھے،

(الف) لاطینی زبان کا عام رواج میں نہ ہونا،

(ب) جسٹی نین کا سارے قانونی مدرسوں کو بند کر دینا بجز قسطنطنیہ اور بیروت کے،

(ج) بیروت کا ۵۵۱ء کے زلزلے میں تباہ ہو جانا، اور وہاں کے مدرسۂ قانون کا

بالآخر ۶۲۶ء میں ختم ہو جاتا۔

(۱۴) جہاں تک پہلے سبب کا تعلق ہے، اب یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جسٹی نین کا دورِ حکومت لاطینی زبان کے لیے ایک نقطۂ انقلاب تھا کہ اگر پہلے وہ عام استعمال کے باہر تھی تو اب وہ سرکاری استعمال سے بھی خارج کر دی گئی، جسٹی نین کے "جدید احکام" Novellae [جو اسی حکمراں کے "مجموعۂ قوانین" Corpus Juris کے ترمیمات پر مشتمل تھے] یا تو دو زبانوں میں شائع ہوئے، یا صرف یونانی میں، لاطینی کے بغیر، لیکن قانون ملک کی کتابوں یعنی "مجموعۂ قوانین" Corpus Juris، "عہود" Institutes، "مدوّنہ احکام" Code اور "خلاصہ" digest کے قدیم اجزاء لاطینی ہی میں رہے، ان کے جو یونانی ترجمے ہوئے بھی ۔ (تیوفیل Theophilus نے کتاب "عہود" کا شرح ترجمہ کیا تھا، اور اس مترجم کے سرکاری عہدے کے باعث اس کو نیم سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی تھی) ۔ ان کا واحد مقصد یہ نظر آتا ہے کہ طلبۂ قانون کو سال اول کے ابتدائی زمانے میں مطالعے میں سہولت بہم پہنچائی جائے۔ اس کی کوشش کبھی نہیں کی گئی کہ قوانین ملک کے، [جو لاطینی میں تھے]، بڑے اور اہم حصے کو ایسی زبان میں پیش کیا جائے [بزنطینی سلطنت میں] عام طور پر سمجھی جاتی ہو، ایسی کوشش اگر ہوئی بھی تو جسٹی نین کے دو سو سال بعد۔[ل]

ل کتاب منتخب Ecloga ۷۴۰ء / ۱۲۲ھ میں، "دستی کتاب" Procheiron ۸۰۰ء / ۱۸۰ھ اور ۸۵۰ء / ۲۳۶ھ کے درمیان، اور "شاہی کتاب" Basilica اس کے بھی بعد کی ہیں، جب کہ امام مالک ۷۹۵ء / ۱۷۹ھ میں اور امام ابو حنیفہ ۷۶۷ء / ۱۵۰ھ میں وفات پا چکے تھے، (مولف) ۔ حتیٰ کہ امام اوزاعی کا ۷۷۳ء / ۱۵۷ھ میں امام ابو یوسف کا ۷۹۸ء / ۱۸۲ھ میں امام محمد شیبانی کا ۸۰۴ء / ۱۸۹ھ میں اور امام شافعی کا ۸۲۰ء / ۲۰۴ھ میں انتقال ہوا، اور ان ہی کی کتابیں اب تک اسلامی قانون پر سند سمجھی جاتی ہیں، اور بعد کے سارے مؤلف ان ہی کی کتابوں کے خوشہ چیں ہیں۔ (مترجم)

یعنی اس وقت جب اسلام اور بزنطینیوں کے سیاسی تعلقات اسے تن گئے تھے کہ رومی قانون سے براہ راست نقل کا کوئی سوال نہیں تھا، اور یہ وہ وقت ہے جب اسلامی قانون کی اصل بنیادیں پڑ چکی تھیں،

(۱۵) جسٹی نین نے اپنے Omnem [جامع] نامی حکم نامے کے ذریعے قسطنطنیہ اور بیروت کو چھوڑ کر سارے علاقوں کے قانونی مدرسے بند کرا دیے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ رومی نظریات doctrine پاک صاف حالت میں اور [ہر جگہ] یکساں رہیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ہر قسم کے [مفید] نئے خیالات کے داخلے کا دروازہ بالکل بند ہو گیا، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح ہر چیز کو مرکز کے ماتحت لانے کی کوشش قوت کی نہیں بلکہ ایسے ضعف کی علامت تھی جس کا شعور بھی ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح قدیم تر زمانے میں رومی فوجوں کا برطانیہ سے واپس بلا لینا، جو بھی ہو، اس میں تو شک نہیں کہ قانونی تعلیم کے مدرسے واقعۃً بند کر دیے گئے، جب قانون اور عدالتیں دونوں شہنشاہ کی مرضی پر منحصر ہو جائیں تو قانون پیشہ لوگوں کے لیے یہ بداہتہً ایک فضول چیز ہو جاتی ہے کہ کوئی ایسی سند حاصل کریں جسے شہنشاہ تسلیم نہ کرتا ہو۔ اس کے باوجود پروفیسر شلڈٹن آموس کا دعویٰ ہے کہ بیروت اور اسکندریہ کے [رومی] مدارس قانون مسلمانوں کے شام و مصر کو فتح کرنے کے بعد ایک صدی سے زائد عرصے تک چلتے رہے،

(۱۶) بیروت کا آگے ذکر آئے گا، جہاں تک اسکندریہ کا تعلق ہے، شلڈٹن آموس کے ادعا کا واحد ماخذ یہ ہے کہ آگاتیاس[ل] Agathias نامی شخص نے "جامع" نامی حکم نامے کے نفاذ کے ربع صدی بعد اسکندریہ میں قانون کی تعلیم پائی تھی، اس لیے یہ معلومات

ل یہ ایک یونانی مورخ ہے جس نے جسٹی نین کے دور کی ایک تاریخ لکھی ہے۔ (مترجم)

اس کو براہ راست نہیں، بلکہ ثانوی طور پر ایک غیر معروف فرانسیسی مؤلف دمونت روی[1] (De Montreuil) کی اپنی غلط فہمی کے باعث حاصل ہوئے ہیں، [اصل میں] آگاتیاس ۵۵۱ء کے زلزلے کا ذکر کرتا ہے، اور اس تاریخ کی اساس پر "مسلمانوں کے شام و مصر فتح کرنے کے بعد ایک صدی سے زائد عرصہ" کہنا دور کی کوڑی لانا far cry ہے.

[کہ ۵۵۱ء اسلام سے قبل کا زمانہ ہے]. آگاتیاس کے [یونانی] الفاظ یہ ہیں: "میں وہاں یعنی اسکندریہ میں — قانون سے پہلے ایک عمومی تعلیم میں مشغول تھا". اس کے معنی جیسا کہ نیبور[2] (Niebuhr) نے ٹھیک سمجھا ہے، صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ "قانون [کی تعلیم] سے قبل ایک عمومی liberal تعلیم". اس کے بعد آگاتیاس یہ بھی بیان کرتا ہے کہ وہ اسی سال اسکندریہ چھوڑ کر بزنطہ (قسطنطنیہ) روانہ ہوگیا — اور بیروت کے زلزلے کے بعد وہاں کے مدرسے کے باقیات الصالحات جو بھی شہر صیدا Sidon میں رہے ہوں

---

[1] دمونتروی نے اسکالیجر Scaliger کے ۱۶۰۶ء کے ترجمے پر بھروسہ کیا تھا۔ (مؤلف) [2] نیبور نے آگاتیاس کی نظم کو Corpus scriptum historicorum byz یعنی "بزنطینی تاریخی رسائل کا مجموعہ" کی جلد سوم، طبع بون Bonn ۱۸۲۸ء میں شائع کیا، یہ کتاب کمرر "یونانی پادریوں کی تحریروں کا مجموعہ" شائع کردہ میں Migne, Patrologia Graeca کی جلد (۸۸) طبع پارس ۱۸۶۴ء میں بھی شائع ہوئی ہے۔ لیکن اس میں نظمیں نہیں ہیں۔ آگاتیاس کے اپنے [یونانی] الفاظ "پر د تون ناموس" (یعنی "قانون سے پہلے") بذات خود بے معنی ہیں، اور اس کے یہ معنی تو قطعاً نہیں ہو سکتے کہ "قانونی پیشہ شروع کرنے سے پہلے" بلکہ کوئی نہ کوئی لفظ محذوف ماننا پڑے گا۔ جو بیان صرف یہی ہو سکتا ہے کہ لفظ "پیدیاس" [یعنی "تعلیم"] کی تکرار مراد ہے [اور تکرار سے بچنے کے لیے شاعر نے اسے حذف کیا ہو، [مترجم]۔ اس عبارت کو بعض لوگ "پر دس تون ناموس" [یعنی "قانون کیلیے"] پڑھنا چاہتے ہیں، لیکن اس سے بھی وہ معنے نہیں نکلتے جو اسکالیجر اور دمونتروی نے اس سے لیے ہیں۔ (مؤلف)

ان کو چھوڑ دیں تو اس وقت کا جو واحد مقام جہاں قانون کی تعلیم حاصل کی جا سکتی اور اسے بطور پیشہ استعمال کر سکنے کی سند مل سکتی تھی، وہ بزنطہ تھا، اور بزنطہ ہی میں اس نے قانونی تعلیم کا آغاز و اہتمام کیا تھا.

(۱۱) اس کا قطعی ثبوت اشعار میں ملتا ہے، ان میں سے ایک نظم epigram میں (جو "منتخب یونانی اشعار" Anthalogia Graeca، ج ۱ ص ۳۵ میں ہے) ایک بھینٹ کا ذکر ہے، جو طلبہ قانون کی ایک جماعت کی طرف سے چڑھائی گئی تھی، اس جماعت میں آگاتیاس بھی ہے، اور اسکندریہ کا روفینوس Rufinus بھی جنھوں نے قانونی تعلیم کا چوتھا سال اسی زمانے میں ختم کیا تھا، اور یہ بھینٹ میکائیل فرشتے[1]

---

[1] [انجیل کے آخری رسالے] "مکاشفہ" Apocalypse [فصل ۱۲ جملہ ۷] کی بنا پر یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ میکائیل فرشتہ حضرت اسرائیل کی تائید میں بحث کرنے والا بھی ہے، اس مفہوم کے لیے عبرانی زبان میں سانیگور Sanegor کا لفظ ہے، جو اصل میں یونانی لفظ "سانیگوروس" کی عبرانی شکل ہے، جو بلیوں کی کتاب" Book of Jubilees [جس میں توریت کی کتاب پیدائش میں مذکورہ واقعات ہی کو کسی نے عبرانی میں لکھا ہے (مترجم)] میکائیل علیہ السلام کا مزید یہ کام بھی بتاتی ہے کہ وہ معلم ہے اور حضرت موسیٰ کو خدا کی طرف سے قانون کی تلقین کرتا ہے۔ جیسے کہ مماثل اسلامی عقائد کے مطابق جبرئیل فرشتہ قرآن نازل کرتا ہے۔ میکائیل فرشتے کے آسمانی فوج کا سپہ سالار ہے، لیکن یہودی ربیوں کی لکھی ہوئی کتب مناقب و فضائل Hagiology کے مطابق وہ ایک بڑا وکیل اور متعلق یہ تصور [یہودیوں سے] عیسائیوں میں آیا انجیل کی کتاب یہودا فقرہ (۹) کی شہادت سے ثابت ہو جاتا ہے [جس میں لکھا ہے: چنانچہ جب مقرب فرشتہ میکائیل نے شیطان سے اختلاف کیا اور موسیٰ [علیہ السلام] کی لاش کے متعلق اس سے جھگڑا کیا تو بھی اس نے شیطان پر توہین کا الزام لگانے کی جرأت نہ کی، بلکہ صرف یہ کہا، پروردگار، تجھے ڈانٹے" (مترجم)]. شاید اس سے اس بات کی توجیہ ہو سکتی ہے کہ کیوں نوجوان قانون پیشہ لوگوں کی ایک نہیں تین تین نظمیں ایسی ملی ہیں جو میکائیل فرشتے سے معنون ہیں، ایک کا اوپر ذکر ہوا، دوسری میں یہ بتایا گیا ہے کہ میکائیل فرشتہ تھیوڈور Theodore نامی شخص کو شہر افسوس Ephesus میں مجسٹریٹی کے تمغے [علامتیں] عطا کر رہا ہے (دیکھو مذکورہ "منتخب یونانی اشعار" ج ۱ ص ۳۶) اور تیسری قسطنطنیہ کے مضافات کے ایک مقام "پلاگ" کی مورت سے متعلق ہے۔ (مؤلف)

کی مورت eikon پر بمقام "ایوستینیا" چڑھائی گئی تھی، یہ مقام آبنائے بوسفورس [بوغاز، استانبول] پر ہے اور اب خلیج استینیا Stenia Bay کہلاتا ہے، اپنی تعلیم کے پانچویں سال [آگاتیاس] پایۂ تخت کی لغویات اور بداخلاقیوں سے تنگ آکر شہر سے کنارہ کشی کرتا ہے، اور سکون کے ساتھ قانون کا عمیق مطالعہ کرنے کے لیے شاخ زریں کے [یعنی Golden horn جسے اب ترکی میں "خلیج" کہتے ہیں، اور جو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار تک جاتی ہے] (مترجم) شمالی ساحل پر سکونت پذیر ہوگیا، یہاں اس کے اور اس کے دوست پاولوس سیلنتیاریوس Paulus Silentiarius کے مابین — جو بظاہر آگاتیاس کی قانون سے وابستگی کو کچھ زیادہ سنجیدہ چیز نہیں سمجھتا تھا — خطوط کا تبادلہ ہوا، جن کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے، ان کا متن مذکورہ "منتخب یونانی اشعار" ج ۵ ص ۲۹۲ - ۲۹۳ میں محفوظ ہے. آگاتیاس کے نام والی دیگر نظمیں بھی غالباً اسی زمانے سے متعلق ہیں، اگرچہ ان کے محل وقوع کا تعین اتنا قطعی نہیں، مثلاً وہ کتبہ جو ایک قانونی درس کے رفیق کی قبر پر ہے (دیکھو "منتخب یونانی اشعار" ج، ص ۵۷۴)، نیز وہ جن میں اس کے دوست نائب قنصل[1] تھیوڈور Proconsul Theodore سے تخاطب ہے۔

(۱۸) بیروت[2] کا مدرسہ ۵۵۱ء کے جب زلزلے سے تباہ ہوگیا تو اس کے اساتذہ اور طلبہ کو صیدا بھیج دیا گیا، جہاں وہ تقریباً دس سال مقیم رہے، ۵۶۰ء میں جب وہ بیروت واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے، تو مدرسے پر یہ نئی مصیبت آئی کہ مدرسے کے لیے [بیروت میں] جو نئی عمارتیں تعمیر ہوئی تھیں وہ ایک آتشزدگی میں برباد ہوگئیں، اور — جیسا کہ

[1] زیر بحث زمانے میں نائب قنصل سے مراد کسی صوبے کا والی (گورنر) ہوا کرتا تھا (مترجم) [2] کولینے کی فرانسیسی کتاب "بیروت کا مدرسۂ قانون" Collinet, Histoire de l'ecole de droit de Beyrouth پیرس ۱۹۲۵ء صفحہ (۵۷ تا ۵۸) (مولف)

پروفیسر کولینے Collinet نے [حوالۂ بالا میں] بتایا ہے — اس تاریخ کے بعد سے اس [مدرسے] کا پھر کوئی ذکر نہیں ملتا، اور ۶۰۰ء میں بیروت کھنڈر ہی تھا، اس کے بعد کے سالوں میں جو مصیبتیں آئیں ان کے باعث یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب مسلمانوں نے اسے فتح کیا تو وہ کھنڈروں کے انبار کے سوا کچھ اور رہا ہو، یہ فتح ۱۴ھ/۶۳۵ء میں ہوئی جبکہ مدرسے کی تباہی پر پچھتر برس گزر چکے تھے، اور اس کے آخری استاد کو مرے ہوئے، اور وہاں کے آخری درس کو بھلائے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا، عربوں کی فتوحات سے تین چوتھائی صدی قبل کے عرصے سے رومی سلطنت میں تربیت یافتہ قانون دانوں کے ملنے کا واحد ماخذ پایۂ تخت بزنطہ تھا،

(۱۹) قانون کے ان مدرسوں کی برقراری کا افسانہ: جس دوسری اساس پر مبنی ہے وہ فون کریمر Von Kremer کا ایک اتفاقی اور ضمنی ملاحظہ (ریمارک) ہے، اور جو لوگ اساطیر اور افسانوں کی نشو و نما کا مطالعہ کرتے ہیں ان کے لیے یہ دلچسپی کا باعث ہوگا کہ زیر بحث افسانے کی نشو و نما کس طرح ہوئی: اس ممتاز مورخ فون کریمر نے اپنی جرمن کتاب "مشرق کی ثقافتی تاریخ" میں (جس کا خدا بخش نے ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں انگریزی ترجمہ شائع کیا، دیکھو ص ۱۴۴) ایک خیال پیش کیا ہے کہ دو قدیم مسلمان فقیہ، امام اوزاعی اور امام شافعی[1] چونکہ شام میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے وہ "بے شبہہ ایسے بہت سے بزنطینی قواعد سے واقف رہے ہوں گے، جو رسم و رواج کی شکل میں برقرار رہے ہوں گے"، بعد والے راویوں کے ہاتھوں میں "بے شبہہ" کی جگہ "مسلمہ طور پر" اور "رسم و رواج" کی جگہ "بزنطینی قانون"

[1] امام شافعی غزہ (فلسطین) میں پیدا ہوئے، دو سال کی عمر میں ان کو مکہ مکرمہ لیجایا گیا، عمر کا حصہ حجاز اور یمن میں گزرا، کچھ عرصہ بغداد میں رہے، آخری چند سال مصر میں گزار کر مصر ہی میں فوت ہوئے۔ (مترجم)

ہو گیا، ایک مولف نے تو یہاں تک لکھ مارا کہ "جیسا کہ بہت معروف بات ہے کہ انھوں [یعنی شافعی] نے فقہ کی تعلیم بیروت میں پائی"! امام اوزاعی ایک ہندو غلام کے پوتے تھے[1]، زندگی شام، خاصکر بیروت میں گزاری. ان کے حالات زیادہ معلوم نہیں، دوسرے بیانات میں باہم تضاد ہے[2]۔

---

[1] امام اوزاعی کے متعلق ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" (طبقۂ خامسہ، ۲۳۳) میں لکھا ہے کہ "کان اصلہ من سبی السند" یعنی وہ سندھ کے قیدیوں کی اولاد میں سے تھے اور یہ کہ انھوں نے زندگی کا آخری زمانہ بیروت کی چھاؤنی میں فوجی سپاہی کی حیثیت سے گزارا، لیکن مسعودی کی "مروج الذہب" طبع یورپ میں "سبی السند" کی جگہ "سبی الیمن" چھپا ہے، جو غالباً سہو کتابت ہے، کیونکہ اموی دور میں یمن کوئی غیرمسلم علاقہ نہ تھا کہ اس سے جنگ ہو اور قیدی پکڑے جائیں، یمن عہد نبوی ہی میں مسلمان ہو گیا تھا، وہاں جنگ اور قیدیوں کا کبھی موقع پیش نہیں آیا، بجز اس کے کہ سندھ کے قیدی پہلے یمن لائے گئے ہوں، پھر شام بھیجے گئے ہوں، امام اوزاعی نے اپنی عمر کا آخری حصہ بیروت کی فوجی چھاؤنی میں گزارا نہ کہ زندگی خاص کر بیروت میں گزاری، جیسا کہ مولف نے لکھا ہے، "ہندو غلام کا پوتا" نہ معلوم کہاں سے نکالا ہے، ماخذوں میں ایسی کوئی صراحت نہیں ملتی۔ (مترجم) [2] اپنے فاضل رفیق ڈاکٹر شیخ عبدالقادر کی ــ [جس سے مراد شاید علی حسن عبدالقادر ہیں (مترجم)] مدد سے میں نے ان سارے بیانات کی تحقیق کی جو تاریخ طبری میں اوزاعی کے متعلق ہیں، نیز اس کتاب کی جو جنگ کے مال غنیمت کے مسئلہ پر اوزاعی اور ابو حنیفہ کے اختلاف کے متعلق ابو یوسف نے لکھی ہے ــ [بظاہر یہ اشارہ امام ابو یوسف کی کتاب الرد علی سیر الاوزاعی کی طرف ہے، جسے حیدرآباد دکن کی احیاء المعارف النعمانیہ نے مصر میں چھپوایا ہے، اور جو امام شافعی کی کتاب الام کے باب "سیر الاوزاعی" کا ملخص ہے۔ (مترجم)] ــ لیکن ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے رومی تاثیر کا سراغ ملتا ہو، طبری کی کتاب "اختلاف الفقہاء" کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے جس میں اوزاعی کے کثیر اقتباسات ہیں، شاید اوزاعی کی طرف منسوب فقہ کی ایک کتاب مسجد القیروان Al Kairawan کے کتب خانے میں بھی پائی جاتی ہے (مؤلف) ــ مسجد قیروان (تونس) میں کوئی کتبخانہ نہیں ہے مولف کی مراد شاید مسجد القرویین (فاس، مراکش) سے ہے، اس کے مشہور کتبخانے میں مجھے ایسی کوئی کتاب نہیں ملی، بروکلمان Brockelmann, Gal اور فؤاد سزگین Fuat Sezgin, Gas کی جن فہرستوں میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں۔ (مترجم)

بہر حال ان کا مذہب فقہ بہت جلد غائب ہو گیا، اور اگر اس کی کوئی تاثیر رہی بھی ہو تو اس کا سراغ نہیں ملتا، اسلامی قانون میں امام شافعی ایک بڑی شخصیت گزرے ہیں، ماں کی طرف سے وہ پیغمبر اسلام کی اولاد [سید] تھے، اور باپ کی طرف سے ایک متوازی شاخ میں تھے [یعنی رسول اکرم کے پردادا ہاشم کے بھائی مطلب کی اولاد میں تھے، (مترجم)] وہ اگرچہ غزہ (فلسطین) میں پیدا ہوئے، لیکن کم عمری میں مکہ لیجائے گئے، جہاں سے انھیں طفولیت ہی میں ایک بدوی قبیلے میں بھیج دیا گیا[1]، تاکہ خالص اور پاک صاف عربی زبان سیکھیں. پھر عنفوان شباب میں انھوں نے فقہ کی تعلیم بیروت میں نہیں، بلکہ مدینہ منورہ میں پائی،

(۲۰) لیکن ہم سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "دمشق میں پورا رومی نظام عدالت، عربی فتوحات کے ایک صدی بعد تک برقرار رہا"[2]، اس دعویٰ کی سند سوّاس پاشا کا بیان ہے، جو اس کی فرانسیسی کتاب "اسلامی قانون کے نظریات کا مطالعہ" Etude de la Theorie du droit musulman طبع دوم ۱۹۰۲ء میں ذیل کے الفاظ میں، کتاب کے مقدمے کے صفحہ (۲۱) میں درج ہے:

"اے سب لوگ جانتے ہیں کہ اسلامی قانون کی پیدائش کے وقت رومی قانون نے اس پر جو اثر ڈالا. اس سے قطع نظر بھی فقہ کا متاخر اور تکمیل کنندہ ارتقاء اور اسلامی مجموعۂ احکام کا نشو و نما ان علماء کا کارنامہ ہے جو علم قانون کی تعلیم دیتے اور وہ فرائض انجام دیتے تھے جو رومی دور کے] شام میں پریٹر[3] Pretor انجام دیتے تھے، .... حضرت معاویہ]

---

[1] عربوں کی اس رواج کی مماثل چیز قرون وسطیٰ کے آئرلینڈ میں رضاعت Fosterage کی شکل میں پائی جاتی تھی (مولف)
[2] اور یہی بیان شلڈن آموس کی طرف منسوب کیا گیا ہے (مترجم) [3] قدیم رومی سلطنت میں حاکم عدالت ایسے شخص کو بنایا جاتا تھا جو رعب داب اور وجاہت کا حامل ہو، مگر یہ عموماً جاہل لوگ ہوتے، اسی لیے عدالتی کام میں مدد دینے کے لیے پریڑنامی ایک عہدہ دار ہوتا تھا، جو حاکم عدالت کو مقدمے سے متعلقہ قانون سے آگاہ کرتا، ہمارے ہاں قانون گو کا لفظ دوسرے معنوں میں برتا گیا ہے، لیکن یہ مشیر عدالت جو قانون بیان کرتا، "قانون گو" کے نام سے موزوں تر طور پر موسوم کیا جاسکتا ہے۔ (مترجم)

کے دور میں شام کا نظام عدلیہ و قضاءت خفیف فرق کے ساتھ وہی رہا جو اسلامی فتح کے قبل پایا جاتا تھا۔ عدالتی مفتی، پریٹر کی طرح، احکام کا خاکہ بنا دیتے تھے، اور مفتی کے بتائے ہوئے ان احکام کی روشنی میں فرائض قضاءت کی انجام دہی کے لیے قاضی واقعات کو اس خاکے کے مندرجات کی روشنی میں جانچتا جو مفتی نے اس کے سامنے پیش کیا تھا اور اپنا فیصلہ اسی رائے کے مطابق سناتا جو پریٹر [یعنی مفتی عدالت] نے اپنے خاکے میں اسے بتایا تھا،

"میں اس بات سے ناواقف نہیں کہ [پریٹر کا حاکم عدالت کو مسئلہ اور جواب کا] خاکہ مرتب کر دینا اگرچہ رومی شہنشاہ دقیانوس [ڈِقلطیانوس Diocletien کے زمانے میں شروع ہوا تھا، مگر بعد میں اس کی جگہ وہ طریق عمل شروع ہوا تھا جسے غیر معمولی طریقہ [extra ordinem cognito غیر معمولی ضابطۂ واقفیت] کہا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ ایک واقعہ ہے کہ [مسلمان] فاتح نے خاکوں کا طریقہ شام میں پوری قوت کے ساتھ زیر عمل پایا۔"

(۲۱) دوسرے الفاظ میں سنو اس پاشانے، جو بے شبہ اصلاحات کی ایک قابل تعریف مہم میں مشغول تھا، اپنی مہم کے لیے ہتھیار فراہم کرنے کی غرض سے نہ صرف یہ باور کر لیا تھا کہ مقدمے کے سوال جواب کا خاکہ مرتب کرنے کا جو طریقہ تھا، وہ اپنے خاتمہ کے چار سو سال بعد بھی کارفرما تھا، بلکہ یہ بھی کہ اسلامی فقہ کے مؤسس اس کی تعلیم دینے اور اس پر عمل کرنے میں ملک شام ہی نہیں، خلیفہ معاویہؓ کے دربار میں بھی مشغول تھے، حالانکہ ایک [حضرت] عمر بن عبد العزیزؒ کو چھوڑ کر فقہاء عموماً حضرت امیر معاویہؓ اور سارے اموی خلفاء کی کم و بیش مسلسل خاموش مخالفت کی حالت میں رہے تھے[1]، حقیقت میں امیر [حکمران]

لہ (حاشیہ ص ۱۰۹ پر ملاحظہ ہو)

اور فقیہ میں جو مقاطعہ ساری اسلامی تاریخ میں نظر آتا ہے، وہ اسی اموی دور میں شروع ہوا، اور ہمارے موضوع سے اس کا اہم تعلق ہے جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا، امام اوزاعی کی واحد مثال کو چھوڑ کر پورے اموی دور اور عباسی دور کے ابتدائی حصہ میں کوئی بھی بڑا فقیہ نہ شام میں مقیم اور نہ وہاں کارفرما رہا، مدینۂ منورہ اور کوفہ ہی فقہ کے اولین مرکز رہے، پھر ابو حنیفہ[1] اور ان کے ساتھی اور احمد بن حنبل بغداد میں رہے، اور شافعی مصر میں،[2]

(حاشیہ ص ۱۰۸) لہ [حضرت] ابو موسیٰ اشعریؓ نے بے شک [حضرت] معاویہؓ کے زمانے میں سرکاری ملازمت قبول کی [؟] لیکن یہ بات جن حالات میں وقوع میں آئی وہ [حضرت] ابو موسیٰؓ کے لیے قابلِ ستائش نہیں خیال کیے جا سکتے۔ ٹریٹن اپنی انگریزی کتاب "خلفاء اور انکی غیر مسلم رعیت (Tritton, The Caliphs and Their Non Muslim Subjects) کے صفحہ (۲) میں لکھا ہے: "اسلامی قانون کی ترقی کا آغاز دربار اور حکومت سے دور رہ کر ہوا۔" سارے ہی اہل علم اس بیان کو تسلیم کرتے ہیں۔ (مولف) — اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ فقہاء اموی خلفاء کی مخالفت کرتے اور ان سے مقاطعے کی حالت میں رہے، امام زہری اور امام اوزاعی سے بڑا اور متقی کون ہو سکتا ہے؟ اور چونکہ اسلام میں حاکم عدالت آزاد تھا، اس لیے فقہا بے جھجک قاضی بننا قبول کرتے تھے، کیونکہ انھیں یہ ڈر نہ تھا کہ خلیفہ یا اس کے متوسل عدالت کی آزادی میں دخل دیں گے، قاضی عام طور پر اچھے فقیہ ہی ہوتے تھے، یوں شاذ و نادر مثالیں شاید ایسی بھی مل جائیں گی کہ نہایت متدین، ذہین اور منصف مزاج لوگ ابتدائے اسلام میں قاضی بنے ہوں لیکن ان پڑھ رہے ہوں اور فقہا سے مشورہ کرتے ہوں، لیکن شاذ کو عام قاعدہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) لہ ابو حنیفہ بغداد نہیں، کوفے میں رہے، تازہ آباد بغداد میں وہ اس لیے دفن ہوئے کہ خلیفہ منصور نے انھیں کوفے سے بغداد بلا کر قید میں ڈال دیا تھا اور وہ وہیں فوت ہوئے، (مترجم) ٢ اصل میں قاہرہ ہے جس کو فاطمیوں نے بسایا تھا، مگر وہ ابھی بنا نہ تھا، فسطاط لکھتا تو صحیح ہوتا۔ (مترجم)

(۲۲) لیکن [سوا اس پاشا کے بیان میں] سب سے بڑی غلطی شاید یہ ہے کہ مفتی کو پریٹر (preetor) کے، اور قاضی کو یودیکس (judex) (یعنی رومی جج) کے مماثل سمجھا جائے، سوا اس پاشا کے ذہن میں ممکن ہے کہ اس کے زمانے کے اعلیٰ عہدہ دار ہوں، جیسے قسطنطنیہ میں شیخ الاسلام اور مصر میں مفتی اعظم (جس کے فرائض منصبی کے متعلق دیکھو لین (Lane) کی انگریزی کتاب "جدید مصری" Modern Egyptians باب چہارم) اگر یہ صورت واقعہ ہے تو بھی پریٹر سے مماثلت دور کی کوڑی لانا ہے، لیکن پرانے زمانے کے مفتی صرف علمائے قانون رومیوں کے juris prudentes یعنی قانون سے واقف لوگوں کی طرح تھے۔ [جن کے ذمے کوئی سرکاری یا عدالتی فرائض نہ ہوتے تھے]، یہ کسی مسئلے کی دریافت پر فتوی یعنی جواب ضرور دیتے تھے لیکن قاضی کے فیصلے کے لیے سوال جواب کا کوئی خاکہ (فارم) مرتب نہیں کرتے تھے۔ اور ساری اسلامی تاریخ میں قاضی اپنے اختیار سماعت میں بالکل خود مختار رہا کیے ہیں،

(۲۳) بعض وقت ابن خلدون کے ایک بیان پر زور دیا جاتا ہے، ابن خلدون اسپینی تھا، اور چودھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے، اس نے جو بڑی تاریخ تالیف کی اس کے مقدمے میں لکھا ہے کہ افکار اسلامی کے اکثر بڑے موسس عجمی تھے، جہاں تک فقہ کے اولین موسسوں کا تعلق ہے، اس دعوی میں کافی ترمیم کی ضرورت ہے، بے شبہہ قرآن مجید کے اڈیٹر [حضرت] زید بن ثابت ؓ ایک آزاد شدہ غلام تھے،[1] ابوحنیفہ اور اوزاعی آزاد شدہ غلاموں کی اولاد[2]

[1] کاتب وحی کو قرآن کا اڈیٹر قرار دینا لغویات اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے، مگر ہم یہاں اس بحث میں نہ پڑینگے (اس کے لیے دیکھو میرے فرانسیسی ترجمۂ قرآن کا مقدمہ برائے تاریخ تدوین قرآن)، حضرت زید ؓ بن ثابت کو موالی سے قرار دینا سہو ذہنی اور نادانستہ غلطی ہے، مولف نے حضرت زید ؓ بن حارثہ کو (جو رسول اکرم ؐ کے آزاد کردہ غلام اور فوجی کمانڈر تھے) حضرت زید ؓ بن ثابت سے (جو کاتب وحی اور قانون وراثت وغیرہ کے ماہر فقیہ تھے) خلط ملط کر دیا ہے، حضرت زید ؓ بن ثابت مدنی عرب اور انصاری ہیں، غلام کبھی نہیں رہے (مترجم) [2] یہ جواب بے محل سمجھا جائیگا کیونکہ ابن خلدون نے عجمی (غیر عرب) لوگوں کا ذکر کیا ہے، غلاموں کا نہیں، اوپر خود مولف نے ذکر کیا ہے کہ امام اوزاعی ہندی کی (سندھی) تھے، امام ابوحنیفہ بھی عجمی ہی تھے۔ (مترجم)

[یعنی لازماً یہ نہیں کہ وہ عرب نہ رہے ہوں] معنے مولی ہونے کے، فقہ کی پیدائش مدینہ اور خود زید ؓ کے کوفہ جیسے عرب شہروں میں ہوئی، خلفاء راشدین میں سے آخری خلیفہ [حضرت علی ؓ] اور مذہب فقہ کی پیدائش کے مابین جو تاریک [یعنی معلومات سے خالی] زمانہ ہے، اس میں بھی مدینہ منورہ میں سات، اور کوفے میں سات فقہاء[1] کا وجود مذکور ہے،[2] مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خالص عرب تھے، اور کوفے والوں کی اکثریت عجمی النسل تھی، لیکن یہ دونوں مقام خالص عربی تھے، اور دونوں، خاصکر کوفہ جغرافی نقطۂ نظر سے رومی اثر سے بہت دور تھے، اس کے برعکس کوفہ ایرانی سرحد سے زیادہ دور نہ تھا اور سورا Sura اور پمبادیتا (Pumbaditha) کے قریب تھا جہاں [یہودی رہتے اور] تلمودی مدرسے پائے جاتے اور ربیوں کا قانون پھل پھول رہا تھا،[3] یوں بھی گے،

[1] یہ ضروری نہیں کہ سات کا عدد اپنے لفظی معنوں میں لیا جائے، اور ہر مدرسۂ فقہ میں بہت سے اساتذہ اور علماء رہے ہوں (مولف) ــ "بڑے" کے معنے "سارے" کے نہیں۔ (مترجم) [2] کوفے کے فقہاء سبعہ سے میں واقف نہیں، مدینے والوں کا اکثر ذکر آتا ہے، سخاوی نے (فتح المغیث، ص ۳۹۹ـــ۴۰۰ میں) وضاحت سے بیان کیا ہے کہ خود قاضی بھی مدینہ منورہ میں اس مجلس ہفت گانہ سے مشورہ لیتے اور اس کے فتوے کے پابند تھے، وہ یہ تھے: (۱) حضرت زید بن ثابت ؓ کے بیٹے خارجہ (جو طلحہ بن عبداللہ بن عوف کے اشتراک سے تقسیم وراثت کے استفتاؤں کا جواب دیتے اور معاہدات کی دستاویزیں لکھتے تھے) (۲) حضرت ابوبکر ؓ کے پوتے قاسم (۳) حضرت زبیر ؓ کے بیٹے عروہ۔ (۴) بی بی میمونہ ؓ، یا بی بی ام سلمہ ؓ کے مولیٰ سلیمان بن یسار (جن کو زرکلی نے "الاعلام" میں ایرانی الاصل بتایا ہے) (۵) عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، (۶) سعید بن المسیّب (۷) حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ کے بیٹے ابوسلمہ یا حضرت عمر ؓ کے پوتے سالم یا ابوبکر بن عبدالرحمن بن الحارث بن ہشام القرشی، تین نام اس ساتویں نشست کے سلسلے میں لیے جاتے ہیں، ممکن ہو کہ باقی چھے میں سے بعض کی وفات پر نئے ارکان اس کمیٹی میں شریک کیے گئے ہوں، (مترجم) [3] سورا کا ذکر یاقوت نے معجم البلدان میں کیا ہے کہ وہاں کی شراب مشہور ہے اور وہاں سریانی رہتے ہیں۔ (مترجم)

یہ صحیح ہے کہ ابتدائی مسلمان فاتح اپنی عیسائی اور یہودی رعایا کے ساتھ جس رواداری کا سلوک کرتے تھے، اس میں عدالتی آزادی بھی شامل تھی [یعنی ہر قوم اور ہر فرقہ اپنے ہی قانون پر عمل کرنے کا مجاز تھا]۔ آرتھوڈاکس فرقے والے ہوں یا بدعقیدہ عیسائی، اور یہودی، سب اس بارے میں مساوی حقوق رکھتے تھے، اور ان کی خصوصی عدالتیں تھیں، وہ مذہبی عدالتیں تھیں[1]، جن کی صدارت متعلقہ "ملت" کے مذہبی قائد ہی کرتے تھے[2]۔

(۲۴) ہم فرض کر سکتے ہیں کہ عیسائیوں کی عدالتیں عام طور پر رومی قانون ہی کے عام اصول کا اتباع کرتی تھیں، خواہ شعوری طور پر یا بغیر شعور کے، مگر اسی حد تک جس حد تک کہ وہ ان اصول کو سمجھتی ہوں، لیکن یہ اس سے بہت مختلف چیز ہے کہ یہ مزعومہ رومی عدالتیں اپنے اعلیٰ تربیت یافتہ پیشہ ور ملازموں کے ساتھ برقرار رہی ہوں،

---

[1] اس کا امکان ہے کہ اس طرح کی کلیسائی عدالتیں عربوں کی فتح سے قبل ہی وجود میں آنے لگی ہوں، مغربی [اطالوی] رومی سلطنت میں جہاں مہلک طور پر مجروح ہونی [دنیوی و کشوری] نظم و نسق کے ہاتھ سے جو عصاءِ اقتدار گرا، اسے کلیسا نے اٹھا لیا تھا، اس میں شک نہیں کہ مشرقی [بزنطینی] کلیسا کی افتاد طبع مقابلۃً کم شدت کے ساتھ عملی تھی، لیکن چھٹی صدی عیسوی کا اور ساتویں صدی کے آغاز کی مصیبتوں اور بدنظمیوں میں [لوگوں کو خدا یاد آیا ہوگا اور] وہ فطرۃً کلیسا کی طرف متوجہ ہوئے ہونگے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر بیت المقدس کی [مسلمانوں کے سامنے] اطاعت قبول کرنے میں وہاں کے بطریق نے قائدانہ حصہ لیا تھا، (مؤلف) — لیکن اسکی توجیہ نالینو نے (دیکھو، رسالۂ معارف جنوری ۱۹۵۳ء) یہ کی ہے کہ یونانی عہدہ دار اسلامی فوجوں کی آمد پر شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، اس لیے مجبوراً مذہبی افسروں نے باشندوں کی قیادت کی۔ (مترجم)

[2] شاید اسکے مماثل چیز انگلستان کے بیت دین (Beth Din) کا اقتدار سماعت ہے جو حکومت کی نظروں میں تو محض ثالثی اور تحکیم کا محکمہ تھا لیکن پکے یہودی کے لیے اس عدالت کے فیصلے مذہبی وجوب کے حامل ہوتے تھے۔ (مؤلف)

اور یہ بات بداہۃً عرب [حکمرانوں] کے لیے ناممکن تھی کہ ایسی عدالتوں کے وجود کو گوارا کریں، جو اسلام کی ماتحتی کو قبول نہ کرنے والی ایک اجنبی سلطنت کی طرف سے مامور ہوں، اور اپنے کو اسی کے ماتحت سمجھتی ہوں، اس سے قطع نظر بھی کہ اسلامی قانون میں (جو خدا کی مرضی پر مبنی ہے) اور رومی قانون میں (جو شہنشاہ کی خوشنودی پر منحصر ہوتا ہے) باہم ایک بنیادی فرق ہے، یہی وجہ ہے کہ [حضرت عمرؓ کے زمانے کی فتح پر] مصر اور بیت المقدس[1] سے جو معاہدے

---

[1] مصر کے معاہدے کے متن کے لیے دیکھو تاریخ طبری طبع یورپ سلسلہ اول صفحہ (۲۵۸۸) اور معاہدۂ بیت المقدس کے لیے بھی وہی کتاب صفحہ (۲۴۰۵ تا ۲۴۰۶)، (مؤلف) — معاہدۂ مصر کے متعلقہ الفاظ ہیں: "ان کی صلح میں جو رومی اور نوبی (نوبیہ والا) داخل ہوگا اسے بھی وہی [حق] حاصل ہونگے جو ان کو ہیں، اور اس پر بھی وہی [فرائض] ہوں گے جو ان پر ہیں جو اس کو نہ مانے اور چلا جانا چاہے اس کو اس وقت تک کے لئے امان ہے جب تک کہ وہ اپنے امن گاہ کو نہ پہنچ جائے یا ہماری سلطنت سے باہر چلا جائے" معاہدۂ بیت المقدس کے جسے اس زمانہ میں ایلیا (Aelia Capitolina) کہتے تھے، ضروری حصے یہ ہیں: "اہل ایلیا پر [واجب] ہوگا کہ جزیہ دیں جس طرح [دیگر] شہروں والے دیتے ہیں، اور وہ اپنے ہاں سے رومیوں اور چوروں کو باہر نکال دیں، ان [رومیوں] میں سے جو باہر جائے گا، اسے جان و مال کا امان ہوگا، تا آنکہ اپنے امن گاہ کو پہنچ جائے، لیکن ان میں سے جو رہنا چاہے اسے امان حاصل رہے گا، اور اہل ایلیا ہی کی طرح اس پر جزیہ دینے کی [پابندی] ہوگی، اہل ایلیا میں سے جو رومیوں کے ہمراہ جان و مال کو لیکر چلا جانا اور اپنے گرجاؤں اور صلیبوں کو چھوڑ دینا چاہے تو اس کی جان و مال اور گرجاؤں اور صلیبوں کو امان رہے گا تا آنکہ وہ اپنے امن گاہ کو نہ پہنچ جائے..... جو جانا چاہے وہ رومیوں کے ہمراہ جا سکتا ہے، اور جو چاہے اپنے لوگوں میں واپس آسکتا ہے، اس سے اس کی فصل کی کٹائی تک کوئی چیز نہ لیجائے گی۔" (مترجم) — ان دونوں اور اس قسم کے دوسرے معاہدوں کے متن کی حد تک کچھ اختلاف روایت پایا جاتا ہے، اور بعض دیگر وجوہ سے، بعض اہل علم کو ان معاہدوں کی صحت میں شبہہ ہے۔ لیکن اگر ان کے متن کے الفاظ پر اتفاق بھی نہ ہو تب بھی اس کے مفہوم کی حد تک

ہوئے ان دونوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ "رومی" یعنی بزنطینی عہدہ دار اجنبی قرار دیے گئے ہیں، بیت المقدس کے معاہدے میں تو پوری صراحت ہے کہ یہ لوگ بالکل [وہاں سے] چلے جائیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۳) زیربحث تفصیلات کے متعلق کافی اتفاق پایا جاتا ہے، طبری کے نقل کردہ ان معاہدہ ناموں اور [ذمیوں سے برتاؤ کے متعلق] حضرت عمرؓ سے منسوب حکم ناموں میں (اسکے لیے دیکھو ٹرٹین کی مذکورۂ بالا کتاب، باب اول) بہت نمایاں فرق ہے، مگر وہ طبری کے بیان کی بنیادی صحت کی تائید ہی کرتا ہے، اس معاہدے کے بعد چند رومی عہدہ دار فلسطین میں رہ گئے اور جب موقع ملا عربوں [مسلمانوں] کی ملازمت میں جگہ پاگئے — [بلاذری نے انساب الاشراف میں حضرت عمرؓ کا جو خط شام کے عامل [گورنر] کے نام نقل کیا ہے، وہ اسکی تائید کرتا ہے: "ابعث الینا برومی یقیم لنا حساب فرائضنا" یعنی ایک یونانی کو ہمارے پاس مدینہ بھیجدو جو ہمارے مالگزاری کے حسابات کا ٹھیک انتظام کرسکے (مترجم)] یہ ایسے لوگ رہے ہونگے جو کیسا ہی ہنگامہ ہو اپنی کاربرآری کر لیتے ہیں لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ ان میں قانون پیشہ لوگ بھی رہے ہوں، دیکھو ٹرٹین کی کتاب بالا، صفحہ (۱۹). حضرت عمرؓ کے حکمنامۂ اہل ذمہ کی ساری مختلف روایتیں ایسے امور سے متعلق ہیں جو آج کے دن تک عملی سیاست سے تعلق رکھتی ہیں [یعنی ذمیوں سے کیسا برتاؤ کیا جائے] اور جیسا کہ ٹرٹین نے بیان کیا ہے: "یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ معاہدہ ناموں کا مسودہ تیار کرنے کی مدارس قانون میں جو مشق کرائی جاتی تھی، یہ اس کا نمونہ ہے"۔ اس کے برخلاف طبری کے نقل کردہ عہدنامے مختصر اور عملی ہیں، اور جن مسئلوں سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ ایسے ہیں کہ معاہدے پر عمل شروع کرتے ہی ان کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے، اس لیے مشکل ہی سے اسکا امکان پایا جاتا ہے کہ وہ کسی آیندہ ضرورت کے لیے جعلی طور پر تیار کیے جائیں۔ (مولف) — بیت المقدس کا معاہدہ طبری کے علاوہ یعقوبی نے بھی نقل کیا ہے، اور مصر کا معاہدہ قلقشندی کی صبح الاعشیٰ، نیز حمزہ ابو عبید کی کتاب الاموال میں بھی ہے، معاہدۂ بیت المقدس پر لین پول (Lane-Poole) نے اور معاہدۂ مصر پر لین پول کے علاوہ بٹلر (Butler) نے بھی مقالے لکھے ہیں، یہاں معاہدۂ بعلبک بھی قابل ذکر ہے، جس کا متن بلاذری کی فتوح البلدان میں ہے، اور اس میں بھی یونانیوں کا ذکر ہے: "یہ امن نامہ فلاں بن فلاں — [غالباً کوئی یونانی نام ہوگا (مترجم)]—

ان میں یہ بھی ذکر ہے کہ اگر وہ رہنا چاہیں تو نجی طور پر رہیں[1] [سرکاری ملازم اور حاکم کے طور پر نہیں]۔

(۲۵) لیکن شلڈن آموس یاسو اس پاشا سے بھی ایک بہت بڑے فاضل یعنی اگناتس گولٹ سیہر کو بھی اس طرح کی رائے کے لیے بطور سند پیش کیا جاتا ہے، انصاف کا تقاضا ہے کہ گولٹ سیہر کے متعلق ہم اولاً یہ بتادیں کہ اس کی زیربحث رائے اس موضوع پر خود اسی مولف کی ساری دیگر رایوں کے خلاف ہے، اور بہ ظاہر زیادہ گہرے غور و فکر کے بعد اس نے مذکورہ رائے کو ترک کر دیا تھا، کیونکہ اسلامی قانون پر اس کا [جرمن زبان میں] جو شہ کار ہے — یعنی "اسلام پر لکچر" (Vorlesungen über den Islam) اور جس کا ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی ترجمہ آرین نے "اسلام کا قانون اور عقیدہ" (Arin) (La loi et le dogm de l' Islam) کے نام سے شائع کیا — اس میں اس کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔

(۲۶) بہرحال ۱۸۸۴ء میں گولٹ سیہر نے ہنگری کے ایک علمی رسالے میں[2] "اسلامی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۴) اور اہل بعلبک یعنی وہاں کے رومیوں اور عجمیوں اور [غیرمسلم] عربوں کے لیے ہے.... رومی اپنے ریوڑوں کو پندرہ میل کے رقبے میں چرنے کے لیے لے جاسکتے ہیں.... جمادی الاولیٰ کے بعد وہ جہاں جانا چاہیں چلے جائیں، ان میں سے جو مسلمان ہو جائے وہ ہمارے مساوی حقوق و فرائض کے ساتھ رہے گا، ان کے تاجر [ہمارے] مفتوحہ علاقے میں جہاں چاہیں جاسکتے ہیں، مگر جو رہ جائے تو اسے جزیہ اور خراج [مالگزاری] دینا واجب ہوگا"۔ (مترجم)

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی مسلمانوں کی رعیت اور ذمی کے طور پر، (مترجم) [2] اس کا خلاصہ بھی اسی زمانے میں ایک اور رسالے میں بھی شائع ہوا ہے (مؤلف) — مؤلف نے زیادہ تفصیل نہیں دی ہے۔ (مترجم)

قانون کا ماخذ" (Muhammedan jugtudomany eredeteröl) کے عنوان[1] سے ایک مضمون شائع کیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی مضمون کا [انگریزی] ترجمہ امریکہ میں "مورخوں کی تاریخ عالم (Historians' Hinstory of The world) نامی کتاب میں ۱۹۰۷ء میں چھپا، اس میں اس کا [انگریزی] عنوان ہے "اسلام میں قانون کے اصول"۔ اس مضمون میں گولٹ سیہر نے بعض رائیں ظاہر کیں، اور رومی اور اسلامی قانونوں کی بعض مشابہتیں دکھا کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ مشابہتیں براہ راست نقل (borrowing) کی بنا پر ہونی چاہئیں مگر گولٹ سیہر نے ۱۸۸۹ء تا ۱۸۹۰ء میں اپنی جو جرمن کتاب "اسلامی مسائل (Muhammedanische Studien) شائع کی ہے، اس میں مذکورہ رائے کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا، اور اس کے بعد کی کتاب "اسلام پر لکچر" میں جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا، گولٹ سیہر نے ان خیالات کو بالکل ہی ترک ترک کر دیا ہے، بجز اس مختصر اور ضمنی ملاحظے کے کہ اسلامی فقہ اور [رومی] Prudentia میں مشابہت ہے۔ [اس لاطینی اصطلاح سے آگے بحث آئے گی۔]

---

[1] مجھے اصل [ہنگری] مضمون کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، اس لیے مجبوراً اس خلاصے پر اعتماد کرنے پر مجبور ہوں۔ جسے تاجر کتب گوتنر (Geuthner پاریس) نے گولٹ سیہر کی فہرست تالیفات میں شامل کیا ہے، اس کتابیات میں گولٹ سیہر کی کسی ایسی تالیف کا ذکر نہیں جس سے مذکورہ [انگریزی] ترجمہ عمل میں آیا ہوا ہو۔ (مؤلف)

(باقی)

سیّد امیر ماہ بہرائچی

از جناب معین احمد صاحب علوی

سید سالار مسعود غازی علیہ الرحمہ کے نام نامی کی وجہ سے کون ہے جو بہرائچ کے نام سے واقف نہیں، تاریخ کے ہر دور میں بہرائچ کا تذکرہ ملتا ہے، مہاتما بدھ کے زمانہ کے آثار کی گواہی آج بھی ضلع کے کچھ کھنڈرات سے ملتی ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے بعد بہرائچ کا نام تاریخ کے اوراق کی زینت بنتا ہے، سید سالار مسعود غازیؒ اپنی فوجی طاقت کے ساتھ شمالی ہندوستان کی سیاسی طاقتوں سے مورچہ لیتے بہرائچ تک آکر گھر جاتے ہیں، یہاں قوم بھڑ کے راجاؤں نے متحد ہو کر اُن سے جنگ کی اور ۴۲۴ھ مطابق ۱۰۳۳ء میں ۱۴ ماہ رجب روز یکشنبہ کو آپ یہاں شہید ہو گئے، آپ کا مزار بھی بعد کو یہاں بنا اور میلا بھی لگتا ہے، اسی زمانے سے بہرائچ کی شہرت برابر قائم ہے، محمد شاہ تغلق اور فیروز شاہ تغلق دونوں آپ کے مزار پر حاضری دینے آئے، فیروز شاہ تغلق کی آمد کے موقع پر سید امیر ماہ نامی بزرگ کا نام آتا ہے، اس نے ان ہی بزرگ کی معیت میں سید سالار مسعود غازیؒ کے مزار پر حاضری دی تھی، سید امیر ماہؒ کے روحانی اثرات سے متاثر ہوا تھا، اور اسکی زندگی میں بعض تبدیلیاں ہوئی تھیں، فیروز شاہ کی آمد اور سید امیر ماہ صاحبؒ کی ملاقات کے متعلق تاریخ فیروز شاہی کی شہادت ہے کہ: "بسیار صحبت نیک وگرم بر آمد"۔

کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سید امیر ماہؒ کے زمانے میں آپ کو سب نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، اس دور کے جتنے صوفی بزرگ ہیں سب نے کسی نہ کسی انداز میں آپ کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کے ملفوظات میں آپ کا نام نامی موجود ہے،

(۱) آپ کا پورا نام سید افضل الدین ابو جعفر امیر ماہ بہرائچی ہے،[1] فیروز شاہی عہد (۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء تا ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) کے مشہور بزرگ ہیں، تاریخ فیروز شاہی میں آپ کا تذکرہ ہے،[2]

(۲) حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (متوفی ۷۸۲ھ) بہار کے مشہور صوفی بزرگ کے ملفوظات میں بھی آپ کا مختصر ذکر ہے۔،

(۳) حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ (متوفی ۸۰۸ھ) کے ملفوظات لطائف اشرفی وغیرہ میں جس کو ان کے مرید و خلیفہ شیخ نظام الدین غریب یمنی نے جمع کیا ہے، آپ کا ذکر ان الفاظ میں ہے،

از سادات بہرائچ سید ابو جعفر امیر ماہ	بہرائچ کے سادات میں سے سید ابو جعفر
را دیدہ بودم	امیر ماہؒ کو میں نے دیکھا ہے۔

(۴) حضرت امیر سید علی ہمدانیؒ[3] (متوفی ۷۸۶ھ) کشمیر کے سب سے پہلے صوفی اور صاحب تصنیف اور مشہور بزرگ ہیں۔ اپنی کتاب عمدۃ المطالب میں ہندوستان کے ان بارہ[12] صحیح النسب خاندانوں کا حال لکھا ہے جو ولایت سے ہندوستان آئے، ان میں بھی سید امیر ماہ صاحبؒ کا نام نامی ہے۔[4]

---

[1] حیات مسعودی، مرتبہ عباس خاں شروانی ص ۴۳، [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۰، ۳ [3] آپکی خانقاہ آج بھی تخت سلیمانی کے نام سے مشہور ہے، آپکی ذات والاصفات سے کشمیر میں اسلام کو فروغ ہوا۔ لطائف اشرفی میں آپ کو "جامع علوم ظاہری و باطنی" کے الفاظ سے یاد کیا ہے، نام و کنیت ابو الفضائل عبد الرحمن بن محمد المیانجی اور لقب عین القضاۃ ہے، وطن ہمدان، آپ امام احمد غزالی اور شیخ محمد بن حمویہ کے ہم صحبت تھے، ۵۲۳ھ میں وفات پائی۔ [4] تاریخ ائمہ ا ۵ دص ۵۵ مطبوعہ مطبع نظامی۔

(۵) تاریخ فرشتہ نے فیروز شاہ کے سفر بہرائچ کے تذکرہ میں امیر ماہؒ کا تذکرہ کیا ہے، فیروز شاہ آپ کی بزرگی سے متاثر ہو کر آپ ہی کے ساتھ سید سالار مسعود غازیؒ کے مزار پر حاضر ہوا تھا، راستہ میں سید صاحب سے حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کی بزرگی و کرامات کے واقعات پوچھنے لگا، آپ نے فرمایا کہ "یہی کرامت کیا کم ہے کہ آپ کا ایسا بادشاہ اور میرا ایسا فقیر دونوں ان کی دربانی کر رہے ہیں"۔ اس جواب پر بادشاہ جس کے دل میں عشق کی چاشنی تھی بہت محظوظ ہوا،[1]

(۶) تاریخ فیروز شاہی کے سلسلے میں پروفیسر خلیق احمد نظامی (علی گڈھ مسلم یونیورسٹی) اپنی کتاب "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" میں لکھتے ہیں[2]:- کہ "میر سید امیر ماہ بہرائچ کے مشہور و معروف مشائخِ طریقت میں تھے، سید علاء الدین المعروف بہ علی جاوری سے بیعت تھی، وحدت الوجود کے مختلف مسائل پر رسالہ المطلوب فی العشق المحبوب لکھا تھا، فیروز شاہ جب بہرائچ گیا تھا، تو ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، اور "بسیار صحبت نیک وگرم بر آمد"،

فیروز شاہ کے ذہن میں مزار (حضرت سید سالار مسعود غازیؒ) سے متعلق کچھ شبہات بھی تھے، جن کو سید امیر ماہ نے رفع کیا، عبد الرحمن چشتی (مصنف مرأۃ الاسرار) کا بیان ہے کہ اس ملاقات کے بعد فیروز شاہ کا دل دنیا کی طرف سے سرد پڑ گیا تھا، اور اس نے باقی عمر یاد الٰہی میں کاٹ دی۔

یہ بیان مبالغہ آمیز ضرور ہے لیکن غلط نہیں، بہرائچ کے سفر کے بعد فیروز پر مذہب کا غلبہ ہو گیا تھا"۔

---

[1] حیات مسعودی ص ۴۴۔ از عباس خان شروانی مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، [2] ص ۴۴۰

(۷) مصنف آئینۂ اودھ نے حضرت سید احمد والد ماجد مولانا خواجگیؒ [1] کے ذکر کے سلسلے میں حضرت سید علی ہمدانی کی دوسری کتاب منبع الانساب سے یہ عبارت نقل کی ہے کہ

حضرت میر سید مخدوم مولانا خواجگی صاحب کہ قبر او در کڑہ است بسیار بزرگ و صاحب کمال از خلفائے میر سید علاء الدین جے پوری اند حضرت ابوجعفر امیر ماہ بہرائچی و حضرت مخدوم مذکور ہم تاش خواجہ بودند۔ ایں ہر دو بزرگان و خلیفہ کامل حضرت میر سید علاء الدین جے پوری اند۔ [2]

میر سید علاء الدینؒ کو مصنف بحر الانساب حضرت سید علی ہمدانی نے امام عالم، عالم متدین، قطب السادات فی دقتہ، استاذ الارادات اور سید السادات کے الفاظ سے یاد کیا ہے، آپ سلسلۂ سہروردیہ کے مشہور رہنما ہیں۔

مصنف مراۃ الاسرار مولوی عبد الرحمٰن چشتی نے جو حضرت سید سالار مسعودؒ کی روح پر فتوح سے فیضیاب ہوئے تھے، اور عرصے تک بہرائچ میں مقیم رہے تھے، اسی عقیدت میں مراۃ مسعودی لکھی ہے، مراۃ مداری بھی آپ کی تصنیف ہے، مراۃ الاسرار میں مکتوبات حضرت مخدوم اشرف جہانگیر کچھوچھوی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"میر سید اشرف جہانگیر سمنانی اپنے ایک مکتوب ۳۲ میں (جس میں سادات بہرائچ کا تذکرہ ہے) لکھتے ہیں: "سادات خطۂ بہرائچ کا نسب بہت مشہور ہے، سادات بہرائچ میں سید

[1] مولانا خواجگی (متوفی ۸۰۰ھ) ہندوستان کے نامور ترین علماء، استاذ الاساتذہ اور مجدد دین علم میں ہیں (تاریخ دعوت و عزیمت مولانا ابوالحسن ندوی ص ۱۷۱) آپ مرید و خلیفہ تھے شیخ نصیر الدین محمود "چراغ دہلی" کے شاگرد مولانا معین الدین عمرانی کے اور استاد ہیں قاضی شہاب الدین جونپوری کے، مزار آپ کا کالپی کے باہر ہے۔ (مراۃ الاسرار) مزید تفصیل رسالہ معارف جلد ۷۰، ص ۹۳ متعلق قاضی شہاب الدین دولت آبادی۔ دیکھی جاسکتی ہے [2] آئینۂ اودھ ص ۲

ابوجعفر امیر ماہ کو میں نے دیکھا ہے، دادی تفاوت میں بے نظیر تھے، سید شہید مسعود غازی کے مزار کی حاضری کے موقع پر میں اور سید ابوجعفر امیر ماہ اور حضرت خضر علیہ السلام ساتھ ساتھ تھے، ان کی شیخت کے اکثر حالات کیلئے میں نے حضرت خضر علیہ السلام کی روح سے استفادہ کیا ہے، سید امیر ماہ کا مزار زیارت گاہ خلق ہے"۔

مراۃ الاسرار کے بیسویں طبقہ میں میر سید علاء الدین کنتوری کے حالات کے بعد حضرت سید امیر ماہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام کی علیحدہ سرخی قائم کرکے تفصیل سے حالات لکھے ہیں۔ "عارف پیشوائے یقین"، "مقتدائے وقت"، "کاملان روزگار"، "بزرگانِ صاحب اسرار" کے القاب سے تذکرہ شروع کیا ہے۔ لکھتے ہیں

"شانے عظیم و کراماتے وافر و حالے قوی و ہمتے بلند داشت"۔ صاحب عالی مقام بود۔ عالمے از نعمت او فیض مند گشت"۔

آپ کا زمانہ حضرت نصیر الدین محمودؒ "چراغ دہلی" (متوفی ۷۵۷ھ) کے زمانے سے لیکر حضرت میر سید اشرف جہانگیرؒ (متوفی ۸۰۸ھ) تک ہے۔

خزینۃ الاصفیا کے مصنف مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی معارج الولایت کے حوالے سے حالات لکھے ہیں۔

تاریخ آئینۂ اودھ کے مصنف مولانا شاہ ابوالحسن قطبی والحسامی مانکپوری نے افسران کمشنری کے ساتھ اپنی ملازمت کے دوران سفر کیا، خود بہرائچ آئے اور یہاں کے لوگوں سے مل کر تحقیقات کرکے ایک پورے باب میں اس کی تفصیلات لکھی ہیں، اس کو ہم نقل کرتے ہیں:

ہلاکو خان کے ہنگامۂ بغداد سے پریشان ہو کر ۶۵۷ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں سید

حسام الدین جد سید افضل الدین ابو جعفر امیر ماہ بہرائچی بغداد شریف سے جلا وطن ہو کر براہ غزنی لاہور آئے۔ بعد قیام چندے لاہور سے دہلی آئے، اس وقت بادشاہ دہلی سلطان غیاث الدین بلبن تھا، اُس نے آنا آپ کا باعث یُمن سمجھکر وظیفہ مقرر کر دیا، ۷۴۳ھ میں جب محمد شاہ تغلق نے دہلی کو ویران کر کے دیوگرھ دولت آباد دکن لیجانا چاہا، اس وقت سید نظام الدین والد ماجد حضرت کے وہاں نہ گئے اور جانب اودھ متوجہ ہوئے، ۷۴۴ھ میں سواد مقام بہرائچ پسند مزاج ہوا، اور طرح اقامت ڈالی۔ ۷۵۴ھ مطابق ۱۳۵۳ء میں جب فیروز شاہ تغلق سفر بنگالہ سے وارد بہرائچ ہوا تو سید افضل الدین ابو جعفر امیر ماہ کا معتقد ہو کر چند دیہات واسطے صرف خانقاہ کے عطا و معاف کیے، ان کے بیٹے سید تاج الدین[۱] ان کے سید مسعود[۲]، ان کے سید احمد اللہ[۳]، ان کے سید محمود[۴]، ان کے سید مبارک[۵]، ان کے سید ناصر الدین[۶]، ان کے سید نظام الدین[۷]، ان کے سید رکن الدین[۸]، ان کے سید علی الدین[۹]، ان کے سید غلام حسین[۱۰]، ان کے سید غلام رسول[۱۱]، اس وقت تک سب لوگ محی سنت آبائی کے رکھ طریقۂ رشد و ارشاد جاری رکھتے تھے، اور اہتمام اعراس کا کرتے رہے، جب اُن کے بیٹے سید غلام حسین ثانی[۱۲] ہوئے، ان کو ویسا فضل و کمال حاصل نہ تھا، وہ طریقۂ آبائی رشد و ارشاد ضعیف ہو گیا، ان کے دو پسر غلام محمد[۱۳] و غلام رسول ثانی[۱۴]۔ یہ معاصر تھے، نواب شجاع الدولہ بہادر کے بعد صلح بکسر[۱] کے جب صلح نامہ گورنمنٹ انگلیشیہ سے ہوا تو نواب ممدوح الذکر نے حکم ضبطی کل معافیات صوبۂ اودھ کا صادر کیا، یہ دونوں بھائی لطبع بجائی معافی

---

[۱] صلح بکسر۔ بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء میں نواب میر قاسم۔ نواب شجاع الدولہ حاکم اودھ اور شاہ عالم بادشاہ دہلی نے مل کر انگریزوں سے بکسر کے مقام پر لڑی تھی جس میں انگریزوں کو فتح ہوئی۔ اس کے بعد ۱۷۶۵ء میں لارڈ کلائیو گورنر بنگال نے صلح نامہ کیا، جو صلحنامۂ الہ آباد کے نام سے مشہور ہے۔

بتبدیل مذہب آبائی پابند مذہب امامیہ ہو گئے، اس قدر فائدہ تبدیل مذہب سے ہوا کہ نصف معافی بحال اور نصف ضبط ہو گئی، اس وقت سے بجائے اعراس کے تعزیہ داری کرنے لگے"

خاندانی شجرہ کے بعد سید صاحب کے روحانی شجرہ کو جو سہروردیہ تھا، پچیس ۲۵ واسطوں سے حضرت علیؓ تک اس طرح لکھا ہے:

ذکر سید افضل الدین ابو جعفر امیر ماہ بہرائچی۔

یہ مرید و خلیفہ حضرت علاء الدین[۱] جے پوری اور وہ حضرت قوام الدین[۲] اور وہ اپنے باپ امیر کبیر سید قطب الدین[۳] محمد مدنی، اور وہ سید نجم الدین[۴] کبری اور وہ حضرت عمار یاسر[۵] اور وہ حضرت ابو نجیب[۶] سہروردی اور وہ شیخ احمد[۷] غزالی اور وہ حضرت ابو بکر[۸] نساج اور وہ ابو القاسم[۹] گرگانی اور وہ حضرت ابو عثمان[۱۰] مغربی اور وہ ابو علی[۱۱] کاتب اور وہ حضرت علی[۱۲] رودباری اور وہ حضرت ابو القاسم[۱۳] قشیری اور وہ ابو علی[۱۴] دقاق اور وہ حضرت ابو القاسم[۱۵] نصیر آبادی اور وہ حضرت ابو بکر[۱۶] شبلی اور وہ حضرت جنید[۱۷] بغدادی اور وہ حضرت سری[۱۸] سقطی اور وہ حضرت معروف[۱۹] کرخی اور وہ حضرت علی[۲۰] موسیٰ رضا اور وہ حضرت موسیٰ کاظم[۲۱] اور وہ حضرت امام جعفر[۲۲] صادق اور وہ حضرت امام باقر[۲۳] اور وہ حضرت امام زین العابدین[۲۴] اور وہ حضرت امام حسین[۲۵]ؓ اور وہ حضرت علی[۲۶] کرم اللہ وجہہ کے تھے۔

سلسلۂ انساب پدری یہ ہے:

سید ابو جعفر امیر ماہ بہرائچی بن سید نظام الدین بن سید حسام الدین بن سید فخر الدین ابن سید یحییٰ بن سید ابو طالب بن سید محمود بن سید حمزہ بن سید حسن بن سید عباس بن سید محمد ابن سید علی بن سید ابو محمد اسماعیل بن حضرت امام جعفر صادق تا حضرت علیؓ۔

(۱) مراۃ الاسرار کے مصنف سید احمد ماہ سے خود ملے تھے، وہ لکھتے ہیں:۔

"میر سید احمد را در سلطنت جہانگیر بادشاہ مکرر دیدہ بودم مردے نیک بود۔"

(۲) حضرت شاہ نعیم اللہ صاحب بہرائچی (متوفی ۱۲۱۸ھ) کے خاندان کے ایک فرد ڈاکٹر خطیب صاحب کی ملکیت تاریخ آئینۂ اودھ کے حاشیے پر ایک عبارت لکھی ہوئی ہے، یہ تحریر مولوی محمد فاروق صاحبؒ کی ہے،

تاریخ آئینۂ اودھ کے ص ۱۵۵ پر میرماہ صاحب کے حالات میں اس خاندان کے ایک بزرگ مولوی علی الدین صاحب کا تذکرہ آیا ہے، ان کے نام پر مولوی محمد فاروق صاحب نے ذیل کا حاشیہ لکھا ہے:۔

"یہ حضرت مولانا شاہ نعیم اللہ صاحب (متوفی ۱۲۱۸ھ) کے مرید تھے، اور حضرت مظہر جان جاناں سے بہت عقیدت رکھتے تھے، ان ہی کی فرمائش سے بشارات مظہریہ حضرت نے لکھی ہے، اس میں ان کا ذکر محمد ماہ کے نام سے ہے، بہت سے شاہی کاغذات میں ہیں، جب محمد ماہ صاحب کی مہر دیکھی تو حضرت نانا صاحب سے سوال کیا، انھوں نے جواب دیا کہ یہ خاندان میرماہ کا ہے، سجادہ محمد ماہ کے نام سے موسوم ہوتا تھا، اور شہر بھر میں جب تک قاضی کی مہر کے ساتھ ان کی مہر نہ ہوتی تھی وہ کاغذ معتبر نہ سمجھا جاتا تھا۔

اور یہ بھی سنا ہے کہ ان کے خاندان کے شیعہ ہو جانے سے اہل علم میں بڑا ہیجان پیدا ہوا اس سے صاحبِ[۱] ازالۃ الغین اودھی تعلق رکھتے تھے، انھوں نے ......[۲] اس خاندان کے بہت سے لوگ اودھ میں تھے۔"

---

[۱] مولوی حیدر علی۔ انکی تصنیف ہے ازالۃ الغین عن بصارت العین باثبات شہادت الثقلین، مطبوعہ مطبع ثمر ہند لکھنؤ، ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۵ھ۔ یہ ضخیم کتاب دو جلدوں میں ہے۔
[۲] یہاں کیڑا لگ جانے کی وجہ سے کچھ پڑھا نہ جا سکا۔

مکرمی محمد شایق صاحب کلیم نگروری نے (جو اسی خاندان کے معتبر اور ذی علم فرد ہیں) جو شجرے ہم کو دیکھنے کو عنایت فرمائے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کی اچھی خاصی آبادی کا اودھ (اجودھیا) ضلع فیض آباد میں اب بھی ہے اور ان سے سلسلۂ مناکحت برابر قائم ہے، چاند ماہ کا خاندان مشہور ہے،

مرزا خداداد بیگ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بہرائچ اپنی کتاب "ترنم خداداد در ذکر مسعود" (مطبوعہ ۱۸۸۸ء) کے ص ۳۰ پر میرماہ صاحب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت کے بھائی سید علاء الدین ماہرو اودھی اجودھیا میں مقیم رہے اور وہاں کے صاحب ولایت ہوئے

مصنف آئینۂ اودھ لکھتے ہیں "طہارتِ نسب میں ان لوگوں کے کچھ شک نہیں، وصلت اور مصاہرت ان کی ساتھ سادات جرول کے ہے،

شاہ تقی حیدر قلندر کاکوروی اپنی کتاب تذکرۃ الابرار میں ص ۱۵ پر لکھتے ہیں کہ میرماہ صاحب کے خاندان کی ایک صاحبزادی حضرت شاہ مجا قلندر لاہوری کاکوری کے خاندان میں حضرت عبدالرحمٰن جانباز قلندر کو منسوب تھیں، ان کی دوسری بیوی تھیں، حضرت عبدالرحمٰن جانباز قلندرؒ نے ۹۷۶ھ میں وصال فرمایا،

اولاد و امجاد اولاد کے سلسلہ میں صرف دو صاحبزادوں کا تذکرہ ملتا ہے، جن سے خاندان پھیلا،

(۱) حضرت سعید ماہ عرف چاند ماہ (۲) حضرت تاج ماہ

حضرت سعید ماہ کی اولاد قصبہ نگرور ضلع بہرائچ میں آباد ہے، جو بہرائچ سے گونڈہ جانے والی سڑک پر عین اس جگہ واقع ہے جہاں سے بلگرام پور کو سڑک جاتی ہے، (بہرائچ سے غالباً تیسرے میل پر)

حضرت سعید ماہ کی زوجۂ اولیٰ مدنی تھیں، ان کے چار بیٹے ہوئے، سید علی ماہ[۱]،

(۲) سید جان ماہ (۳) سید عالم ماہ (۴) سید بڑے ماہ،

سید علی ماہ اور سید جان ماہ کی اولاد نگرور میں آباد ہے، موجودہ زمانہ میں سید شایق حسین صاحب کلیم نگروری اور سید افتخار حسین صاحب عرف علن میاں اور سید ضرغام حسین صاحب مشہور اور باعزت ہستیاں ہیں۔[1] اس کے علاوہ کچھ شیخ صاحبان کی آبادی بھی ہے، جو اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے،

دوسرے بیٹے حضرت تاج ماہ کا تذکرہ متعدد کتابوں میں ملتا ہے، جن کے نام اوپر لکھے جاچکے ہیں، اب موجودہ زمانے میں سید محمد جعفر عرف جانی میاں (اکبر پورہ) اور سید ناظم جعفری ساکن محلہ ناظر پورہ اس خاندان کے افراد میں ہیں،

(۱) مراۃ الاسرار کے مصنف نے بھی میر ماہ کے ایک صاحبزادہ سید تاج ماہ کا تذکرہ کیا ہے، جو عمر میں سب سے چھوٹے بیٹے تھے، لکھتے ہیں :-

"عجب حالے قوی داشت۔ دائم الخمر بود و بطریق ملامتیہ رفتے و جمال ولایت خود را از نظر اغیار پوشیدہ داشتے"

اس کے بعد یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ "کسی زمانہ میں سید امیر ماہ بیمار پڑے تو بیٹے نے والد کی زندگی سے ناامید ہوکر بیماری سلب کر کے اپنے اوپر اوڑھ لی اور "جان در مشاہدہ حق تسلیم کرد"۔ میر محمد ماہ صاحب کو تو صحت ہوگئی، مگر غمگین باپ کو لڑکے کی استعداد باطنی کا احساس ہوا اور فکر مند رہنے لگے، اتفاقاً ایکدن انکی قبر پر گئے تو دیکھا کہ ایک مجاور کی ہتھیلی پر بخط سبز" یہ شعر لکھا تھا، جب تک وہ زندہ رہا مٹا نہیں۔

بگو اے مرغ زیرک حمد مولیٰ کہ جان تاج مہ بر عرش بردند

روحانی سلسلہ | حضرت کے روحانی سلسلہ کے لیے ہم کو آپ کے چھوٹے بیٹے کے مزید حالات

[1] یہ معلومات ہم کو سید شایق حسین صاحب کلیم نگروری سے حاصل ہوئے۔

مراۃ الاسرار میں شیخ محمد متوکل کنتوری کے حالات میں ملے، جو حضرت نصیر الدین محمود اودھی "چراغ دہلی" کے مرید اور خلیفہ تھے، اور بہرائچ میں حضرت امیر ماہ سے مستفید ہوئے تھے، اور ان کی خانقاہ میں مدتوں چلہ کش رہے، ان کے بیٹے اور خلیفہ برحق شیخ سعد اللہ کبیر وار نے آپ کے ملفوظات جمع کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ میر سید امیر ماہ بہرائچی اور شیخ محمد متوکل کنتوری میں بڑی محبت اور یگانگت تھی، ان کی خاطر آپ بہرائچ جاتے تھے، اپنے صاحبزادہ شیخ سعد اللہ کبیر وار کو میر سید امیر ماہ کی خدمت میں ارادت کے لیے پیش کیا، سید صاحب نے فرمایا کہ "اس لڑکے کی پشت سے ایک لڑکا ہوگا جو میرا مرید ہوگا"۔ چنانچہ شیخ سعد اللہ دہلی میں حضرت چراغ دہلی کے مرید ہوئے، ان کے متعلق مراۃ الاسرار میں آگے چل کر لکھتے ہیں: شیخ سعد اللہ کے صاحبزادہ شیخ عین الدین قتال ابن شیخ سعد اللہ کبیر وار بڑے عالی مقام تھے، حضرت امیر سید امیر ماہ بہرائچی کے مرید تھے، بڑے صاحب استغراق، نیک نفس اور نفس قاطع کے مالک تھے، اپنے پیر کی خدمت میں رہ کر بڑی ریاضتیں کیں اور تکمیل کے بعد اپنے والد کے پاس کنتور پہنچے، یہاں اپنے حال کو پردۂ ملامت میں چھپائے رکھا، شراب کا شغل اختیار کیا۔

شیخ سعد اللہ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو ان کے بڑے بیٹے شیخ معین الدین سلطان ابراہیم شرقی کی طرف سے کسی جنگ پر گئے ہوئے تھے، شیخ سعد اللہ نے فرمایا کہ اسی خراباتی کو لاؤ، کوئی شخص شیخ عین الدین کو بلانے گیا تو یہ شراب خانہ میں بیٹھے آسمان کی طرف منہ کیے کہہ رہے تھے کہ ایک پیالہ میرے نصیب میں اور ہے، اور لا، دو پیالہ پیا اور زمین پر دے مارا، باپ کے پاس پہنچے اور خرقہ خلافت خواجگان چشت کل امانتوں کے ساتھ آپ کو عنایت ہوا، شیخ عین الدین قتال نے مسند سجادہ پر بیٹھ کر

بڑی شہرت پائی، آپ کا مزار کنتور میں زیارت گاہِ خلق ہے، آپ کی اولاد میں حسب اوّل بزرگ ہوئے ہیں، مصنف مرأۃ الاسرار نے "مشیخت پناہ شیخ محمد مصطفےٰ کے متعلق لکھا ہے، کہ یکے از فرزندان شیخ عین الدین سے شہاب الدین شاہ جہاں بادشاہ نے فیض حاصل کیا، یہ بابرکت شخص مرتاض شگفتہ رو اور پسندیدہ اخلاق شخصیت کی مالک تھی، ۱۰۴۰ھ میں انتقال کیا۔

حضرت تاج ماہ کا مزار اپنے والد سید امیر ماہؒ کے مزار کی چہار دیواری کے باہر شمال جانب موجود ہے، جس کے متعلق معلوم ہوا کہ عوام میں کسی کو پتہ نہ تھا اور نہ کوئی نشان تھا، ایک قبر کے سلسلہ میں ۱۹۳۶ء میں کھدائی ہونے لگی، تو یہ مزار برآمد ہوا، اس پر ایک بوسیدہ پتھر لگا ہوا تھا، وہ پتھر ۱۹۴۷ء تک محفوظ تھا، بدقسمتی سے پڑھے لکھے لوگوں کی بے توجہی اور عوام کی ناواقفیت کی نذر ہو گیا، معتبر عقیدت مندوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ۱۹۵۳ء میں ایک عقیدتمند نے قبر پختہ کرا کے نام لکھدیا اور پتھر ضائع کر دیا۔

تاج ماہؒ کی اولاد شہر بہرائچ محلہ اکبر پورہ اور محلہ ناظر پورہ میں آباد ہے، مرأۃ الاسرار، تاریخ آئینۂ اودھ اور شاہ نعیم اللہ بہرائچی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالوں سے جن جن بزرگوں کے نام سامنے آئے وہ سب سید صاحب کے شجرہ سے ملتے ہیں، یہ شجرہ مصنف آئینۂ اودھ نے تفصیل سے نقل کیا ہے، کتاب کے شروع میں اس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

(۲) تاریخ آئینۂ اودھ کے مصنف خود بہرائچ آئے ہیں اور فرداً فرداً اس خاندان کے لوگوں سے مل کر حالات قلمبند کیے ہیں۔ انھوں نے میر سید امیر ماہؒ کی اولاد میں گیارھویں پشت کے حوالہ سے میر محمد محسن و محمد حسن اولاد غلام رسول سے سید خورشید حسن تیسری پشت کا تذکرہ کیا ہے،

"نواب سعادت علی خاں (۱۲۱۰ فصلی) کے زمانہ میں ان لوگوں کی نصف معافیاں بھی ضبط ہو گئیں، اب مثل زمینداروں کے ان کی اولاد ہو گئی، وہ خالصہ بھی زیادہ تر بیع اور رہن کر ڈالا، چار چکیں مفصلۂ ذیل ہیں:

(۱) اکبر پورہ (۲) متولی پورہ (۳) علی پورہ (۴) قاضی پورہ

۱۹۰۱ء میں یہ جائداد بھی ریاست نانپارہ میں شامل ہو گئی، ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد قانون خاتمۂ زمینداری نے رہا سہا باقی کا بھی خاتمہ کر دیا۔

معافی زمینداری کے پرانے پروانہ جات کی جو تاریخیں مکرمی سید محمد شائق صاحب کلیم نگروری نے عطا فرمائی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آصف الدولہ نواب وزیر اودھ کے وقت میں بھی کچھ جائیداد اس خاندان کو عطا ہوئی، پروانہ جات کی تاریخیں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) پروانہ نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء۔۱۷۹۷ء) مورخہ ۱۶ ربیع الثانی ۱۱۹۹ھ

(۲) پروانہ نواب سعادت علی خاں مورخہ چہاردہم ربیع الثانی ۱۲۵۰ھ

(۳) صلحنامۂ سلطان بمہر قاضی مورخہ ۲۵ محرم ۱۲۵۶ھ

(۴) حکمنامۂ عدالت بمہر قاضی مورخہ ۶ ربیع الثانی ۱۲۵۶ھ

مکرمی کلیم صاحب نگروری کا کہنا ہے کہ یہ کاغذات عاشق علی صاحب نمبردار نے ایک مقدمہ کے سلسلے میں ۲۵ مئی ۱۸۵۰ء کو داخل عدالت کر دیے تھے،

وفات | مرأۃ الاسرار کے مصنف نے لکھا ہے کہ انکی تاریخ وفات نظر سے نہیں گذری، انھوں نے عمر بہت پائی، سید امیر ماہ سلطان فیروز شاہ کے زمانہ میں تھے، سلطان مذکور ۷۵۲ھ میں ۴۵ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، ۷۷۶ھ میں بہرائچ سلطان الشہدا سید سالار مسعود غازی قدس سرہ کے مزار پر حاضری دینے آیا، اور سید امیر ماہؒ سے فیض حاصل کیا،

اسی ملاقات کا تذکرہ شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں ہے، سلطان فیروز شاہ نے ــــہ میں انتقال کیا،

خزینۃ الاصفیا، نے معارج الولایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ میر سید امیر ماہؒ نے ۷۷۲ھ میں انتقال کیا، ان کا مزار پُرانوار بہرائچ میں خلق کی زیارت گاہ ہے، انھوں نے لمبی عمر پائی، حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ کے زمانہ سے (حضرت میر سید اشرف جہانگیر کچھوچھویؒ) کے زمانہ تک زندہ رہے، حضرت کچھوچھویؒ نے سنہ میں وصال فرمایا، اور حضرت سید نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ کی تاریخ وفات سنہ ہے،

مولوی احمد کبیر صاحب حیرت وکیل عدالت ساکن قصبہ پھلواری ولد حاجی مولوی فرید کی ایک کتاب میں جسمیں تمام مشاہیر کی تاریخہائے وفات کے قطعات ہیں، مندرجہ ذیل قطعہ نظر سے گذرا،

ایں میر ماہ عارف بداختر شہادت — بیں نام والد او حضرت نظام دین بود
بغداد بود اصلش بہرائچ ست مسکن — علم دو کون حاصل از اہل درد بنمود
بعد از وصال آں مہ حمدے ہمیں دعا را — باد ایں جناں منور از میر ماہ فرمود
۷۷۲ھ

تصانیف تصانیف کے سلسلے میں صرف ایک کتاب المطلوب فی عشق المحبوب نامی رسالہ کا ذکر ملتا ہے، اس رسالہ کے پہلے باب در بیان عشق کا کچھ حصہ مصنف مراۃ الاسرار...... نے نقل کیا ہے، اور کچھ حصہ حضرت مولانا شاہ نعیم اللہ صاحب بہرائچی نے اپنی کتاب معمولات مظہریہ میں نقل کرکے سالک کے کچھ درجے اور مقامات بتائے ہیں،

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) نے اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" میں ص ۲۵۴ پر تفصیل سے اس رسالہ پر روشنی ڈالی ہے جس کو نقل کیا جاتا ہے۔

"قلب صوفیہ کے نزدیک کیا چیز ہے اور کس طرح بیدار ہو سکتا ہے" کے عنوان پر لکھتے ہوئے خلیق صاحب لکھتے ہیں:

اس عنوان پر صوفیہ نے تفصیل سے لکھا ہے۔ روح الارواح، احیاء العلوم، عوارف المعارف وغیرہ میں اس پر کافی معلومات درج ہیں۔ قرون وسطیٰ کی دو مشہور کتابیں فوائد الفواد (دل کے فائدے) اور قوت القلوب (دل کی غذا) کے نام سے مرتب کی گئی تھیں، اس عنوان پر سب سے زیادہ دلچسپ اور مکمل کتاب رسالہ المطلوب فی عشق المحبوب ہے، جسکو فیروز شاہ کے عہد میں سید محمد امیر ماہ بہرائچی نے تصنیف کیا ہے، یہ رسالہ ایک سو اڑتیس (۱۳۸) صفحات پر مشتمل ہے، اس میں چار باب ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں: (۱) عنوان اول در بیان عشق، (۲) عنوان دوم در بیان دل (۳) عنوان سوم در بیان حجابہائے دل (۴) عنوان چہارم در بیان وصول الی اللہ۔

صفحہ ۳۵ پر پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ اسکا قلمی نسخہ میرے ذاتی کتبخانہ میں ہے، میں نے اس رسالہ سے استفادہ کیا ہے۔

(۲) دوسری کتاب فصول الحکم کی شرح کا بھی تذکرہ بعض ثقہ لوگوں نے کیا ہے لیکن کسی کتاب میں نہیں ملا، کہا جاتا ہے کہ حکیم صدیق احمد صاحب بریلوی (نزد ڈسٹی پوسٹ آفس بریلی) کے کتب خانہ میں ہے، باوجود کوشش کے ابھی تک تصدیق نہ ہو سکی،

رسالۂ المطلوب فی عشق المحبوب کے جن حصوں کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے، ان کو نقل کیا جاتا ہے۔

مراۃ الاسرار

میر سید امیر ماہ کے حالات کی بلندی کا اندازہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہے، جیسا کہ وہ اپنے ایک رسالہ میں فرماتے ہیں:۔ اہل بیت رسول اللہ کے خادم فقیر محمد امیر ماہ علوی نے چند کلمے عشق کے بارے میں وصل کی سنتوں کے طریقہ پر سلطان فیروز شاہ گیتی پناہ کے زمانہ میں جمع کیے ہیں

اس رسالہ کا نام المطلوب فی عشق المحبوب رکھا ہے، اور اس رسالہ میں یہ بھی فرماتے ہیں: اے عزیز آدم صفی علیہ السلام کے اندر عشق کی لگن اس دن پیدا ہوئی جس دن وہ بہشت سے باہر لاکر دنیا میں تنہا، بے یار و مددگار چھوڑ دیے گئے، اور نوح علیہ السلام پر سلطان عشق اس وقت غالب آیا جب انکی کشتی طوفان سے دوچار تھی، اور یونس علیہ السلام پر اس وقت اثر انداز ہوا جب وہ مچھلی کے پیٹ میں محبوس تھے، اور ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت نوازا جب وہ آگ میں پھینکے گئے، اور یعقوب علیہ السلام پر اس دن جلوہ فرما ہوا جب سچ بولنے والے یوسف علیہ السلام ان سے جدا کیے گئے، اور یوسف علیہ السلام نے اسکی لذت اس دن پائی جب وہ مصر کے بازار میں ستر درم کی قیمت پر بیچے گئے، موسیٰ علیہ السلام پر اس وقت رنگ لایا جب مصر سے باہر آئے اور فرعون نے دنبال کیا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس وقت لذت پائی جب انگوٹھی چلی گئی اور وہ ملک سے جدا ہوئے، حضرت زکریا علیہ السلام نے اس وقت عشق کی چاشنی پائی جب ان کے سر پر آرا چلایا گیا، اور محمد رسول اللہ اس دن لذت آشنا ہوئے جب مکہ سے مدینہ ہجرت کی، حسین بن منصور جب پھانسی پر لٹکائے گئے، اور عین القضاۃ ہمدانی جب بورہ میں ڈال کر آگ میں ڈالے گئے، اور اس رسالہ کے جمع کرنے والے پر خطۂ بہرائچ میں مزار حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے قدموں کے نیچے عشق جلوہ فرما ہوا،

اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ فرحت العاشقین کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اسی درمیان میں حضرت خضر علیہ السلام کو ایک دانشمند کی صورت میں سامنے کھڑے دیکھا، وہ فرمانے لگے:

"اے فرزند ہوشیار ہو جا کہ لشکر عشق تجھکو برباد کرنے آرہا ہے"۔

اسی ہفتہ میں نے دیکھا کہ اہل کفر نے جمع ہو کر بہرائچ پر حملہ کیا، گھر کو جلا دیا، ایسا کہ خانقاہ کے چند آدمی شہید ہوئے اور اس فقیر کی بیوی کو شہید کر دیا اور مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ یہی نہیں

بلکہ عشق نے مجھ پر بھی وار کیا جس کا نشان چہرہ پر چاند کی طرح ہے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ عشق کی چاشنی مجھے بھی مل گئی اور اسی سبب سے میں نے یہاں کی بجائے خطۂ اودھ میں سکونت اختیار کی۔

مزار مبارک آئینۂ اودھ کا بیان ہے کہ مزار شریف آپکا جانب اتر کنارے آبادی بہرائچ اندر گنبد خشتی واقع ہے۔ حوالی اس کے چار دیواری پختہ ہے، اور چار دیواری کے دروازہ پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ انوار و برکات مزار شریف سے اس وقت تک پائی جاتی ہیں، اور اہل باطن مالا مال فیض نسبت سے ہوتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں بھی زیارت گاہ خلق ہے، محلہ کا نام بھی عرف عام میں امیر ماہ کے نام سے مشہور ہے، فرق اتنا ہوا ہے کہ اب یہ جگہ قلب شہر بن گئی ہے، بازار مزار شریف تک پھیل گیا ہے، چاروں طرف آبادی ہی آبادی ہے، شمال مشرق جانب پرانے سرکاری اسپتال کی عمارتیں ہیں، جنوب و دکھن سے شمال کو ایک سڑک جاتی ہوئی پچھم جانب سرحد بناتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میونسپلٹی کی عنایت سے کسی وقت میں یہ سڑک قبرستان سے نکالی گئی ہے، کیونکہ سڑک کے دوسری جانب بھی کافی قبریں ہیں، کچھ فٹ پاتھ سے متصل دکھائی دیتی ہیں، کچھ مکانات میں آگئی ہیں، سڑک کے پچھم جانب گنج شہیداں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں، موجودہ احاطہ کے اندر قدیم مسجد ہے، اسی سے ملحق قدیمی کنواں ہے۔ اسپتال کی عمارتوں سے ملی ہوئی زمین پر خاندانی قبرستان ہے۔

عرس آپ کا ۲۹ ماہ ذی قعدہ کو ہوتا ہے، صبح قرآن خوانی کے بعد قل ہوتا ہے، شام کو قوالی کی محفل ہوتی ہے، اور مغرب کے قریب گاگر اٹھ کر مزار پر نذرانۂ عقیدت پیش کیا جاتا ہے، دوپہر سے رات گئے تک میلہ لگتا ہے، تقریباً ۱۱ بجے شب میں مجمع شباب پر ہوتا ہے،

جس میں عورتیں بکثرت نذرانۂ عقیدت پیش کرتی ہیں ،

ایک خاص بات دیکھنے میں یہ آئی کہ اکثر وبیشتر مزار سے ملحق قبرستان کے صحن میں رات میں عوام کی پنچایتیں ہوتی رہتی ہیں، لوگوں کے دلوں میں اب بھی تقدس کا یہ عالم ہو کہ سچائی کے ثبوت یا ضمانت کے طور پر جب پنچایت کے سامنے قسم کھاتے ہیں تو مزار پر قسم کھا کر اینٹ الٹ دیتے ہیں، تب پنچایت کو یقین کامل ہوتا ہے، عوام کا عقیدہ یہ ہے کہ سید صاحب کے مزار پر جھوٹی قسم پھلتی نہیں ہے،

مزار شریف کی دیکھ بھال میاں محمد شفیع صاحب جونا مرچنٹ نہایت خلوص وعقیدت کے ساتھ خاموشی سے کرتے رہتے ہیں، ۱۹۶۰ء سے اب تک آپ نے رفتہ رفتہ مزار شریف کے احاطہ کی حالت سدھار دی، کچھ دوکانیں بنوا کر مزار کو خود کفیل کر دیا ہے، پھاٹک وغیرہ بھی بنوا دیا ہے، جس سے درگاہ شریف کی حفاظت ہوگئی ہے، مسجد بھی بحمد اللہ خوب آباد رہتی ہے، ایک پیش امام مولوی محمد علی صاحب مسجد میں مستقل قیام پذیر ہیں، بحمد اللہ صاحب ذوق ہیں۔

سلطان عبد الحمید کی معزولی کا حقیقی سبب

(ایک جدید انکشاف)

از محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے رفیق دار المصنفین

تحقیق کا قدم ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے، بہت سے مسلمات وحقائق تحقیق کی کسوٹی پر آکر محض کذب و افترا ثابت ہوتے ہیں، ذیل کا مضمون بھی اسی کی ایک مثال ہے، سلطان عبد الحمید کے متعلق یہ عام شہرت ہے کہ وہ ظالم و جابر اور مطلق العنان حکمران تھے، اسی کے نتیجہ میں نوجوان ترکوں کی تنظیم "عثمانی انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے وجود میں آئی تھی، اور بقول خالدہ ادیب خانم "عبد الحمید کی تخت نشینی کا دن عثمانی خاندان کے لیے قومی یوم ماتم کے طور پر منائے جانے کا مستحق ہے"، لیکن کویت کے سرکاری ماہنامہ "مجلة العربي" کے دسمبر ۱۹۷۲ء کے شمارے میں دمشق کے ایک فاضل سعید الافغانی کے قلم سے ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے جس میں سلطان عبد الحمید کے ایک نادر دستخطی خط سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے کہ انجمن اتحاد و ترقی دراصل یہودیوں کی ایجنٹ تھی، اور سلطان کی معزولی محض اس بنا پر ہوئی تھی کہ انھوں نے فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کے مطالبہ کو مسترد کر دیا تھا، رسالۂ مذکور نے سلطان کے اصل ترکی خط کا عکس بھی شائع کر دیا ہے، اس تحقیق کے سامنے آنے کے بعد سلطان کے متعلق عام بیانات بالکل بے وزن ہو جاتے ہیں، اور انکے عہد حکومت کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہو اسکا رخ ہی بدل جاتا ہے، قارئین معارف کے لیے اس کا ترجمہ و تلخیص پیش کیجاتی ہے۔

نعیم

دولت عثمانیہ کے مشہور حکمراں سلطان عبدالحمید ثانی کی معزولی کے حقیقی سبب کو واشگاف کرنے والی جو نادر تاریخی دستاویز ہم پہلی بار پیش کرنے جا رہے ہیں اس کا مطالعہ کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کے عہد حکومت پر ایک اجمالی تبصرہ کر دیا جائے، تاکہ مورخین و محققین نے جن غلط بیانیوں سے کام لیا ہے اس کی حقیقت واضح ہو جائے،

جب سلطان مراد خان خامس کی معزولی کے بعد ۱۸۷۶ء میں شہزادہ عبدالحمید ثانی تخت نشین ہوئے، تو دولت عثمانیہ شدید ترین داخلی و خارجی بحران سے دوچار تھی، سلطان نے عنان حکومت سنبھالتے ہی تمام مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی پوری جد و جہد کی، ان ہی کے عہد میں سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں یورپی اور ایشیائی ممالک میں ریلوے لائن بچھائی گئی، متعدد بندرگاہیں تعمیر ہوئیں اور بغیر کسی غیر ملکی تعاون کے دمشق اور مدینہ منورہ کے درمیان حجاز ریلوے کی بنا پڑی،[1]

سلطان عبدالحمید کے عہد میں عرب کے بہت سے مشاہیر حکومت کے بلند مناصب پر فائز ہوئے، یہ ایک حقیقت ہے کہ عربوں کو سلطان کی بارگاہ میں خصوصی تقرب حاصل تھا، چنانچہ ان کا سکنڈ سکریٹری احمد عزہ پاشا دمشق کا ایک عرب تھا، سلطان کے شیخ ابو الہدیٰ الصیادی بھی مضافات حلب کے رہنے والے عرب تھے، سلطان کو عربوں سے اس حد تک شغف تھا کہ ان کے خاص حفاظتی دستے، فوج کے جنرل اور محل کے ملازمین میں عربوں کی بڑی اکثریت تھی، اس التفات خصوصی کے نتیجہ میں سلطان کو ترکی الاصل عوام کی شدید مخالفت اور غم و غصہ کا سامنا کرنا پڑا، اس کی عام داخلی پالیسی کو "عرب نواز اسلامی سیاست" کا نام دیا جا سکتا ہے، سلطان عبدالحمید کی خارجہ پالیسی بھی جذبات، ناتجربہ کاری اور ناعاقبت اندیشی

[1] فلسفۃ التاریخ العثمانی ج ۲ ص ۱۶۲

کی سیاست نہیں تھی، جیسا کہ بعد میں انجمن اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں Young Turks نے مشہور کر دیا تھا، بلکہ پختہ شعور، کامل تجربہ اور بالغ اندیشی کی سیاست تھی،[1] سلطان کے ایک شدید مخالف سید جمال الدین افغانی نے بھی اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، وہ کہتے ہیں:-

"میں نے انھیں امور جہانبانی کی باریکیوں اور دول یورپ کے عزائم سے مکمل طور پر باخبر دیکھا، وہ سلطنت کے خلاف ہر سازش سے آگاہ رہتے تھے، جس چیز نے مجھکو سب سے زیادہ متحیر کیا، وہ ان کا جاسوسی کا مضبوط نظام ہے، جس کی وجہ سے یوروپین حکومتیں دولت عثمانیہ کے خلاف کوئی اہم قدم نہیں اٹھا سکتی تھیں، اور ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنا یورپی ممالک کی تباہی کے بغیر ممکن نہیں، اور جب یورپ نے ریاست ہائے بلقان کے بارے میں ترکی کے خلاف جنگ کرنے کے مسئلہ پر اتفاق کرنے کی کوشش کی تو سلطان نے اپنی ذہانت اور عجیب و غریب دانشمندی سے ان طاقتوں کے ناپاک عزائم کو ناکام بنا دیا۔"[2]

ہرزل کی سلطان سے سودے بازی

۱۸۹۷ء میں صیہونی تحریک کے بانی ہرزل نے فلسطین میں یہودیوں کا ایک قومی وطن بنانے کی عبدالحمید سے سودے بازی کی تھی،[3] اس کے

[1] فلسفۃ التاریخ العثمانی ج ۲ ص ۱۶۹ [2] خاطرات جمال الدین افغانی ص ۳۵ [3] مترجم: ۱۸۹۷ء میں بیسل میں پہلی صیہونی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس میں ہرزل نے اعلان کیا کہ بیت المقدس کو یہودیوں کا قانونی وطن بنانا چاہیے، اس کے بعد نشر و اشاعت کے ذریعہ یہ تحریک ترقی کرتی رہی، بیت المقدس کے یہودیوں کو منظم کیا گیا، جنھوں نے عربی زبان تک بولنا اور لکھنا چھوڑ دیا اور عبرانی و سریانی زبان کی ترویج شروع کی۔ نعیم

اس کے معاوضہ میں سلطان کی خدمت میں ایک خطیر رقم پیش کرتے ہوئے یقین دلایا تھا کہ اگر سلطان سرزمین فلسطین میں یہودیوں کا وطن بنانے پر رضامند ہو جائیں تو سلطنت عثمانیہ کے ذمہ تمام غیر ملکی قرضوں کو ادا کر دیا جائے گا، جو نادر دستاویز ہم پیش کر رہے ہیں اس سے بتصریح ثابت ہوتا ہے کہ سلطان نے ہرزل کی اس پیشکش کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا، روس فرانس اور انگلستان کی حکومتوں کو اس پر شدید غم و غصہ تھا کہ سلطان نے قسطنطنیہ اور بغداد کے درمیان ریلوے لائن بنانے کا ٹھیکہ ایک جرمن کمپنی کو کیوں دیدیا[1]، چنانچہ انھوں نے

[1] مترجم: ایشیائے کوچک میں جدید ذرائع حمل و نقل کی عدم موجودگی کے باعث سفر کرنا دقت طلب تھا، جس کی وجہ سے جرمنی کو تجارت میں بہت دشواری ہوتی تھی، عثمانی حکومت کے صدر مقام سے ایشیائے کوچک تک جانے کے لیے کوئی ریلوے لائن نہ تھی، چنانچہ ایک جرمن کمپنی نے ۱۸۹۳ء میں ایک ریلوے لائن انقرہ تک تعمیر کی، اس کی وجہ سے سفر اور تجارت میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی، چنانچہ سلطان نے اس ریلوے لائن کو بغداد تک بڑھانے کی اجازت دیدی اور تعمیر کا کام ایک جرمن ریلوے کمپنی کے سپرد کیا گیا، اس ریلوے کی تعمیر سے فرانس اور برطانیہ دونوں کو تشویش پیدا ہو گئی، کیونکہ اس کی تکمیل سے نہ صرف ایشیائے کوچک میں جرمنی کا مکمل، اقتصادی تسلط قائم ہو جاتا بلکہ مسوپوٹامیا اور خلیج فارس کی اقتصادی تسخیر کا بھی خطرہ تھا، جرمنی کے تاجر "بغداد ریلوے" کے جاری ہونے سے مشرق ادنیٰ کے بازاروں پر قابض ہو جاتے۔ اسکے علاوہ نہر سویز کے مقابلہ میں اس ریلوے کے ذریعہ تجارتی اشیا بہت کم وقت میں خلیج فارس تک بھیجی جا سکتی تھیں، حکومت برطانیہ کے لیے زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ ممکن ہو جرمن حکومت "جرمن ریلوے کمپنی" کے تمام حقوق حاصل کر لے اور اس طرح ایک اقتصادی مسئلہ کہیں سیاسی حربہ نہ بنجائے، ان ہی وجوہ کے باعث روس، فرانس اور برطانیہ کو قسطنطنیہ میں جرمنی کا بڑھتا ہوا اثر ناگوار گذرا، (نعیم)

سلطنت کے مختلف عناصر کو عبدالحمید کے خلاف بغاوت کے لیے اکسایا اور اس کے لیے انکی خفیہ مدد بھی کی، جس طرح یہ طاقتیں اس سے قبل ریاستہائے بلقان میں کر چکی تھیں اور اسی سبب سے ترکی میں علیحدگی پسند جماعتیں ابھریں، ان سرکشوں کے رہنما بہت سے ایسے یہودی بھی تھے جو بظاہر اپنے کو مسلمان کہتے تھے، ان جماعتوں کے خفیہ اجلاس غیر ملکوں میں منعقد ہوتے تھے، انجمن اتحاد و ترقی کے بانیوں نے بھی اپنے ابتدائی جلسے پیرس و جنیوا میں کیے تھے، غیر ملکی سفارت خانوں نے سلطان کے خلاف ہر سازش اور بغاوت کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے، اور انجمن اتحاد و ترقی کے یہودی الاصل فوجی افسروں کے ذمہ سلطان کو معزول اور دستوری حکومت قائم کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی، انگلستان اور فرانس خاص طور پر حکومت کے باغیوں کو پناہ دینے میں پیش پیش تھے، اور اس کا تختہ الٹنے کے لیے اپنے ملک میں کام کرنے کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی،

جب سلطان عبدالحمید نے ہرزل کے مطالبہ کو مسترد کر دیا تو یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ جب تک عبدالحمید تخت نشین حکومت رہے گا فلسطین میں ان کے قومی وطن کا قیام ناممکن ہے، چنانچہ ترکی حکومت کا تختہ الٹنے اور اس کے حصے بخرے کرنے کے لیے وہ دو میدانوں میں سرگرم عمل ہو گئے، بیرونی خصوصاً یورپین ممالک میں اپنی مشنریوں اور حکومت پر اپنے اثر و نفوذ کو استعمال کیا، اور اندرون ملک سلطنت کے مختلف عناصر کرد، عرب، ارمن اور چرکس وغیرہ میں جداگانہ قومیت کا جذبہ ابھارا، ان کی یہ کوششیں بارآور ہوئیں، چنانچہ انجمن اتحاد و ترقی نے اپنی خفیہ سوسائٹی کا صدر دفتر سالونیکا میں قائم کیا، یہ شہر اس قسم کی خفیہ سرگرمیوں کے لیے نہایت موزوں تھا، یہاں تحریک انقلاب کو کامیاب بنانے کے لیے انجمن جو پروگرام مرتب کرتی غیر ملکی طاقتیں اس کی پوری پشت پناہی کرتی تھیں[2]، چند دنوں میں باغیوں کی خفیہ

[2] فلسفۃ التاریخ العثمانیہ ج ۲ ص ۱۶۷

سازشیں علانیہ ظاہر ہونے لگیں، سالونیکا میں انجمن اتحاد و ترقی نے ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو علم بغاوت بلند کر دیا، اور سرکش فوج کی طرف سے ترکی کے صدر اعظم کو تار موصول ہوا کہ اگر فوری طور پر دستوری حکومت قائم کی گئی تو انقلابی فوجیں قسطنطنیہ میں داخل ہو جائیں گی، جب سلطان کو یقین واثق ہو گیا کہ اب یہ شورش دبنے والی نہیں ہے، اور دولت عثمانیہ کے خلاف یورپین حکومتوں نے گہری سازش کر لی ہے تو اس نے ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو دوبارہ دستوری حکومت کا قیام منظور کر لیا[۱]

عرب نوجوانوں میں جو قومی احساس غیروں نے غیر شعوری طور پر پیدا کر دیا تھا وہ بھی ابھر آیا، غیر ملکی جماعتیں، تعلیمی ادارے اور سفارت خانے قومی بیداری کے نام سے اس کو ہوا دیتے تھے، سلطنت عثمانیہ میں بیرونی قوموں کے جو اسکول اور کالج پھیلے ہوئے تھے، انھوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھکر نصرانی و یہودی طلبہ کے دلوں کو مسلمانوں کے رعب و خوف سے اتنا بھر دیا کہ ان کو عثمانی شہنشاہیت سے نفرت ہو گئی،[۲]

دولت عثمانیہ کے خلاف تمام شورشوں کے پس پردہ یہودیوں کا نمایاں ہاتھ ہوتا تھا، ان ہی نے غیر ترکی عناصر میں قومی شعور بیدار کیا اور ظلم و استبداد کے خلاف صف آرا ہونے کی حوصلہ افزائی کی، انجمن اتحاد و ترقی نے بھی عوام خصوصاً نوجوان طبقہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے "آزادی مساوات اور عدل" کا نعرہ بلند کیا اور یہ جھوٹا پروپگنڈا کیا کہ سلطان عبدالحمید نہایت استبداد پسند اور مطلق العنان حکمراں ہے، اس کے عہد میں ہزاروں آدمی قتل و غارت کر دیے گئے، اور ہزاروں جیل خانوں میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں، ایسے حاکم کا معزول کیا جانا از روئے ایمان بیحد ضروری ہے، اس پروپگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ اندرون ملک اور پوری دنیا میں یہ خیال عام ہو گیا کہ ترکی عوام شدید گھٹن کے ماحول میں زندگی گذار رہے ہیں،

جیسا کہ ناظرین کرام جانتے ہیں کہ سالونیکا کی باغی فوج پیش قدمی کر کے پایۂ تخت قسطنطنیہ

۱؎ فلسفۃ التاریخ العثمانیہ ج ۲ ص ۱۶۸ ۲؎ ایضاً ص ۱۷۷

میں داخل ہو گئی اور قصر یلدیز کا محاصرہ کر کے معزولی کی قرارداد سلطان کے سامنے پیش کر دی، آپ جانتے ہیں کہ اس قرارداد کو سلطان تک پہنچانے والا کون تھا؟ انجمن اتحاد و ترقی کا ایک یہودی نژاد رکن قرہ صو!! جیسے ہی سلطان کی معزولی اور دستوری حکومت کے قیام کا اعلان ہوا، پوری عثمانی مملکت میں شادیانے بجنے لگے، اور عنان حکومت انجمن اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں کے ہاتھوں میں آگئی، انھوں نے سلطان عبدالحمید کے خلاف جھوٹے الزامات اور افترا و بہتان کی مہم تیز کر دی، پورا یورپ اس پروپگنڈے میں سرگرم ہو گیا کہ عبدالحمید نہایت ظالم و جابر، متعصب، استبداد پسند اور مطلق العنان حکمراں ہے، اس کے عہد حکومت میں ترکوں اور غیر ترکوں کے خون کا دریا بہایا گیا، ہزاروں بے گناہوں کو زنداں میں ڈالا گیا، اسکولوں اور کالجوں میں دولت عثمانیہ کی جو تاریخ پڑھائی جاتی اس میں عبدالحمید کے عہد کو نہایت مسخ کر کے پیش کیا گیا تھا، اس پروپگنڈے کے نتیجہ میں یہ خیال عام ہو گیا کہ "انجمن اتحاد و ترقی" دراصل مملکت عثمانیہ کی نجات دہندہ ہے، اس نے ملک کو ایک نازک وقت میں جور و استبداد کے چنگل اور تباہی کے دہانے سے بچا لیا، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، نوجوان ترکوں (young Turks) نے حریت، مساوات اور عدل کے نام پر انقلاب کا علم بلند کیا تھا، لیکن بعد میں وقت نے خود ہی ان کے جھوٹے اصولوں کا کھوٹا پن ثابت کر دیا، اور اس انجمن کے قائدین کی نااہلی کی بدولت سلطنت عثمانیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فنا ہو گئی،

ان واقعات پر زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ فلسطین کا غم انگیز حادثہ پیش آگیا، اور اہل دانش کی نگاہوں میں واقعات و حقائق خود بخود منکشف ہو گئے، اگر سلطان عبدالحمید نے یہودیوں کا مطالبہ تسلیم کر لیا ہوتا تو آخری سانس تک بڑے اطمینان سے حکومت کرتا رہتا، اب اس حقیقت میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے کہ حکومت ترکی کے خلاف تمام شورشیں اور انقلابی تحریکیں دراصل ایک صیہونی ریاست کے قیام کا دیباچہ تھیں، نوجوان ترکوں کے عہد حکومت میں ہمارے

اساتذہ نے سلطان عبدالحمید اور انجمن اتحاد و ترقی کے بارے میں جو معلومات ہمیں فراہم کیں وہ سراسر کذب و افترا کا پلندہ تھیں، جس حقیقت کا ادراک ہم کو اب ہو رہا ہے، دور اندیش عبدالحمید نے ساٹھ سال قبل ہی اسکو اپنی چشم بصیرت سے دیکھ لیا تھا، لیکن بدقسمتی سے سلطان کو کوئی ایسا شخص نہیں مل سکا جو اسی کی طرح معاملہ کی تہ کو پہنچ سکتا، عبدالحمید کا تخت حکومت دراصل صیہونیت کا نشانہ اور فلسطین کی راہ میں پہلی قربانی ثابت ہوا، جس طرح حجاز کا سابق مرحوم فرمانروا حسین بن علی بھی اسی راہ میں قربانی کا بکرا بنا تھا، جب اس نے فلسطین کے عربوں کے حقوق کے تحفظ میں زیادہ اہتمام کیا تو انگریزوں نے اسے تخت سے اتار کر قبرص میں جلاوطن کر دیا،

سلطان عبدالحمید کی معزولی کے وقت قصر یلدیز میں جو واقعات پیش آئے وہ ایک مقرب درباری زاہد پاشا اکثر اپنے ہم نشینوں کو سنایا کرتا تھا، دمشق کے جن معمر بزرگوں نے ان تفصیلات کو زاہد پاشا کی زبانی سنا ہے انھوں نے خود راقم سطور سے اس کی پوری تفصیل بیان کی کہ جب انقلاب پسندوں کی شورش بے حد بڑھ گئی اور سالونیکا میں بغاوت کا اعلان کر دیا گیا تو صدر اعظم نے فوراً سلطان کو اس سے آگاہ کیا، سلطان نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا "طیب" (یعنی اچھا)

پھر اس نے سلطان کو مطلع کیا کہ باغی قسطنطنیہ کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں، سلطان ان پھر "طیب" کہکر خاموش ہو گیا، صدر اعظم تھوڑی دیر کے بعد سلطان کو خبر کرتا رہا کہ اب انقلابی فوج دار السلطنت میں داخل ہو گئی ہے .... اب وہ قصر شاہی کی طرف بڑھ رہی ہے، .... اب اس نے قصر یلدیز کا محاصرہ کر لیا ہے، اس سب کے جواب میں سلطان صرف ایک لفظ طیب کہتا رہا، صدر اعظم سلطان سے بہت خوف کھاتا تھا، اس لیے اسکو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی

عثمانی فوج کے ایک اطاعت شعار افسر نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر باغیوں سے مقابلہ کرنے کی اجازت طلب کی، سلطان نے اسکو نہایت سختی سے روک دیا، تھوڑی دیر کے بعد اسی افسر نے

دوبارہ آکر عرض کیا کہ ہمارے سپاہی مقابلہ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں، عبدالحمید نے اسکے جواب میں جو کچھ کہا وہ اسکی صلح جوئی، نیکی و صالحیت اور ایثار و قربانی کی بہت بڑی مثال ہے، اس نے کہا:

"میں خوب جانتا ہوں کہ انقلابیوں کا مقصد یا تو میری معزولی ہے یا میرا قتل، اور ظاہر ہے میں فرد واحد ہوں، جب میں تم کو مقابلہ کرنے کا حکم دیدوں گا تو تمھارے اور باغیوں کے ہاتھوں سیکڑوں افراد خاک و خون میں لوٹیں گے، اور تم سب امت اسلامیہ کے افراد ہو، اور یہ امت عنقریب پیش آنے والے شدائد و مشکلات میں تمھاری زیادہ ضرورت مند ہوگی۔"

مذکورہ بالا جواب سے "استبداد پسند" سلطان عبدالحمید کی جو تصویر نظر کے سامنے آتی ہے وہ اس سے قطعی مختلف ہے جو اتحادی نوجوانوں کی پروپیگنڈہ مشینری نے برسر اقتدار آنے کے بعد پیش کی تھی،

دستاویز اور اس کا واقعہ

شیخ محمود ابوالشامات سلسلہ یشرطیہ شاذلیہ کے مشہور صاحب نسبت بزرگ گذرے ہیں، ان کا مزار دمشق کے محلہ قنوات میں مرجع انام ہے، شیخ کے مریدوں میں قصر یلدیز کے مہتمم راغب رضا بے بھی تھے، جب شیخ قسطنطنیہ میں تشریف لاتے تو اپنے مرید کے پاس محل کے گوشے میں قیام کرتے، سلطان عبدالحمید جو سلطنت کی معمولی سے معمولی بات سے آگاہ رہتے تھے، اپنے محل میں شیخ کے قیام سے کس طرح ناواقف رہتے، انھوں نے راغب رضا بے سے اس بارے میں پوچھا، اس نے اپنے مرشد کا تعارف کچھ اس طرح کرایا کہ سلطان بھی ان سے ملنے کا مشتاق ہو گیا، اور پھر ان سے مل کر اتنا متاثر ہوا کہ طریقۂ شاذلیہ میں ان سے بیعت کر لی، سلطان کے ساتھ قسطنطنیہ کے بہت سے معززین، قصر شاہی کے ملازمین اور سپاہی و فوجی بھی شیخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔

جب معزولی کے بعد سلطان کو سالونیکا کے ایک محل میں رکھا گیا تو اس کے حفاظتی دستہ میں

شیخ ابوالشامات کا ایک مسترشد بھی تھا، اسی کے واسطے سے سلطان اور شیخ کے درمیان خفیہ مراسلت ہوا کرتی تھی، چنانچہ سلطان عبدالحمید کا اسی قسم کا ایک اہم خط زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہ کر ہم تک پہنچا، اس تاریخی خط میں سلطان نے اپنی معزولی کے راز سے بہت صراحت کے ساتھ پردہ اٹھایا ہے،

انجمن اتحاد و ترقی کے دور اقتدار میں شیخ نے اس خط کو ایک سربستہ راز کے طور پر محفوظ رکھا، شیخ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادوں نے بھی اس کی پوری حفاظت کی، اور سوائے چند ثقہ اہل تعلق کے کوئی اس سے واقف نہیں ہوا، یہاں تک کہ جب اس دستاویزی خط پر مرور ایام کے اثرات ظاہر ہونے لگے تو بعض دمشقی احباب نے میری توجہ اس طرف منعطف کرائی، میں نے شیخ کے لڑکوں سے اس خط کو دینے کی درخواست کی، کیونکہ اب اس کو پوشیدہ رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا تھا، اور حق کو منظر عام پر لانا ہی چاہئے تھا، تاکہ علماء و محققین اپنی غلط تحقیقات کی تصحیح کرلیں، میں نے اس خط کا عکس لے کر اصل ترکی خط کو شکریہ کے ساتھ شیخ کے ورثہ کو واپس کر دیا ہے، اس خط کا عربی ترجمہ اسی عہد کے ایک ایسے اہل علم نے کیا ہے جو عربی و ترکی دونوں زبانوں پر کامل عبور رکھتے تھے، شیخ ابوالشامات کے ورثہ نے اصل ترکی خط کے ساتھ اس عربی ترجمہ کو بھی حفاظت سے رکھا ہے، اب خط ملاحظہ[1] فرمائیں:-

"........ اس تمہید کے بعد میں آنجناب اور دوسرے اہل دانش کی خدمت میں تاریخ کی امانت کے طور پر ایک اہم معاملہ پیش کرتا ہوں، میں خلافت اسلامیہ سے کسی اور

[1] مترجم:- یہ خط کافی طویل ہے، اور ایک مخلص مرید نے اپنے مرشد کو لکھا ہے، اس لیے خط کا ابتدائی اور آخری حصہ بھی آداب و اظہار عقیدت پر مشتمل ہے، جو عموماً مسترشد اپنے شیخ کے لیے ظاہر کرتے ہیں، یعنی طویل آداب و القاب قلبی واردات اور اوراد و اذکار کی پابندی کا ذکر اور سلام و تحیات وغیرہ اصل موضوع سے خارج ہونے کی بنا پر میں نے ان حصوں کو حذف کر دیا ہے، "ن"

سبب کی بنا پر معزول نہیں کیا گیا، سوائے اس کے کہ نوجوان ترکوں کی انجمن اتحاد و ترقی کے لیڈروں نے مجھے دھمکیاں دیں اور بہت تنگ کیا جس کی وجہ سے مجبور و لاچار ہو کر مجھے خلافت چھوڑنی پڑی۔

بلاشبہ اتحادیوں نے مجھ پر حد درجہ اصرار کیا کہ میں ارض مقدس فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کا مطالبہ منظور کرلوں، ان کے اصرار و دھمکی کے علی الرغم میں نے کسی صورت میں اس کو قبول نہیں کیا، آخر میں انھوں نے بطور رشوت ۱۵ کروڑ ڈالر سونے کی پیشکش کی، میں نے قطعی طور پر اسکو بھی ٹھکرادیا اور انھیں درج ذیل قطعی وحتمی جواب دیا۔

"اگر تم پندرہ کروڑ انگریزی ڈالر سونے کے بجائے پوری دنیا کو سونے سے بھر کر مجھے دو تو بھی میں کسی طرح اس مطالبہ کو منظور نہیں کرسکتا، میں نے تیس سال تک ملت اسلامیہ اور امت محمدیہ کی خدمت کی ہے، اور عثمانی خلفاء و سلاطین میں سے میرے آباء و اجداد نے مسلمانوں کے صحیفۂ اعمال کو سیاہ نہیں کیا، اسلیے میں بھی تمھاری اس پیشکش کو کسی حال میں بھی قبول نہیں کرسکتا۔"

میرے اس قطعی جواب کے بعد انھوں نے میری معزولی پر اتفاق رائے کرلیا، اور مجھے مطلع کیا کہ وہ جلد ہی مجھے سالونیکا کے ایک محل میں نظر بند کردینگے، میں نے ان کے اس عتاب کو گوارا کرلیا۔

میں خداوند قدوس کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ ارض فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام سے جو ابدی ننگ و عار لاحق ہوتا میں نے عالم اسلام اور دولت عثمانیہ کو اس آلودہ کرنا قبول نہیں کیا، اور اس کے بعد جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا، میرا خیال ہے میں نے اس مسئلہ پر صراحت کے ساتھ تمام باتیں عرض کردی ہیں، اور اسی پر اپنا یہ خط ختم کرتا ہوں ...."

فی ۲۲ ایلول ۱۳۲۹

خادم المسلمین
عبدالحمید بن عبدالمجید

سلطان نے اس خط میں یہودیوں اور ان کے ایجنٹ اتحادیوں (انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان) کے اعمال پر جتنی صراحت سے روشنی ڈالی ہے اس سے زیادہ توضیح و تشریح کی گنجائش نہیں ہے، راقم سطور کو خوب یاد ہے کہ جب پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریاں برپا ہوئیں اور ترکی کے ساتھ جو حوادث پیش آئے، اس زمانہ میں ترکی عوام سلطان عبد الحمید کے عہد کو بڑی حسرت سے یاد کیا کرتے تھے، اور جب کسی مجلس میں اس دور کا ذکر آجاتا تو بار بار لوگ "سقی اللہ تلک الایام" (یعنی خدا وہ زمانہ پھر لے آئے) کے الفاظ دہرایا کرتے تھے، اور اس وقت یہ عام خیال ہو گیا تھا کہ عبد الحمید کی معزولی نے درحقیقت ملک پر مصائب و شدائد اور بربادی کا دروازہ کھول دیا ہے۔

اب بھی جب کبھی راقم سطور کو عمر رسیدہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو ان کی زبانوں سے اکثر عبد الحمید اور ان کے عہد کے لیے خیر و برکت اور ترحم کے کلمات سنتا ہے، اب لوگ انجمن اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں اور ان کے پشت پناہ یہودیوں کے مکر و فریب کو بھول چکے ہیں، اور ان کا یہ عقیدہ پختہ ہو گیا ہے کہ انجمن اتحاد و ترقی دراصل صیہونیوں کا ہراول دستہ تھی، اور اگر سلطان نے یہودیوں کے ایجنٹ اتحادیوں کے مطالبہ کے آگے سر جھکا دیا ہوتا تو یہودی ریاست کا خواب ۱۹۴۸ء کے بجائے ۱۹۰۸ء ہی میں پورا ہو جاتا، اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ سلطان عبد الحمید (خدا ان کی تربت کو اپنے انوار سے مالا مال کرے) پہلا شخص ہے جس نے فلسطین کے دفاع میں جام شہادت نوش کیا۔

خریطۂ جواہر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۴)

آقا صادق: رحم می آید مرا بر بلبل آن بوستاں — کز نزاکتہائے گل فریاد نتوانست کرد

مجھکو اس باغ کے بلبل پر رحم آتا ہے جو پھولوں کی نزاکت مزاج سے فریاد بھی نہیں کرسکتی۔

محمد صادق: از ازل صادق بدنیا میل منزش نداشت — چند روزے آمد و یاران خود را دید و رفت

ازل ہی سے صادق دنیا کی طرف مائل نہ تھا، اسی لیے چند ہی دنوں کے لیے دنیا میں آیا اپنے دوست احباب کو دیکھا اور لوٹ گیا، اگر میل ہوتا تو زیادہ قیام کرتا۔

ہر زماں دست تو در گردن خود می بیند — ایں چہ اقبال بلند است کہ مینا دارد

مینا کا نصیبہ بھی کتنا بلند ہے کہ ہر وقت تیرا ہاتھ اس کی گردن میں رہتا ہے (اے کاش یہ مسرت مجھے بھی حاصل ہوتی)

مرزا صائب: اگر تو دامن خود را بدست ما ندہی — ز دست ما نگرفت است کس گریباں را

اگر تو اپنا دامن میرے ہاتھ میں نہیں دیتا تو کسی نے گریباں کو تو میرے ہاتھوں سے نہیں چھین لیا ہے اور گریباں دری تو کوئی نہیں روک سکتا۔

ع ہمارا زور بھی آخر تو چلتا ہے گریباں پر

قمریاں پاس غلط کردہ خود می دارند — ورنہ یک سرو دریں باغ بانداز تو نیست

سرو سے قمریوں کا عشق اپنی غلطی کی پاسداری کا نتیجہ ہے، ورنہ باغ کا کوئی سرو بھی ترے جسم کی دل آویزی کو نہیں پہنچتا، اس لیے قمریوں کے عشق کے قابل تو ہے نہ کہ سرو۔

مارا ز شبِ وصل چہ حاصل کہ تو از ناز — تا بند قبا باز کنی صبح دمید است

مجھکو شبِ وصل سے بھی کیا حاصل جب تک تو ناز سے بند قبا کھولے کھولے صبح نمودار ہو جاتی ہے،

چشم شوخ تو چوں برہم زند مژگاں گردد — دو جہاں فتنہ بہم دست و گریباں گردد

تیری آنکھیں جب پلک جھپکاتی ہیں تو دونوں جہان کے فتنے بہم دست و گریباں ہو جاتے ہیں۔ یعنی تیری آنکھوں میں دونوں جہان کے فتنے خوابیدہ ہیں۔

جائے نمی روی کہ دلِ بدگمانِ ما — تا باز گشتنِ تو بصد جا نمی رود

تو جہاں بھی جاتا ہے، جب تک واپس نہیں آجاتا میرا بدگمان دل اس جستجو میں کہ تو کس کے یہاں گیا ہے، سیکڑوں جگہ گھوم آتا ہے،

آنکہ منعِ من مخمور ز صہبا می کرد — لب مے گونِ ترا کاش تماشا می کرد

جو شخص مجھ مخمور کو مے نوشی سے منع کرتا ہے، کاش وہ تیرے لب میگوں کو دیکھ لیتا تو مجھکو معذور سمجھتا۔

اے قاصد اگر نامۂ دلدار نیاری — از بہر تسلی ز زبانش سخنے گو

قاصد سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ اگر تو معشوق کی طرف سے کوئی نامہ نہیں لایا ہے تب بھی میرے دل کی تسلی کے لیے اپنی طرف سے محبوب کی زبان سے کوئی بات کہہ دے۔

نہ ذوق بودن و نے ز ہرۂ باز گردیدن — چو خندہ بر لبِ ماتم رسیدہ را مانم

نہ ٹھہرنے ہی کا ذوق ہے نہ لوٹ جانے کی گنجایش، میرا حال بھی ماتم رسیدہ کی ہنسی کی طرح ہے کہ لب پر آنے سے اس کو روک بھی نہیں سکتا اور دل کھول کر ہنس بھی نہیں سکتا۔

مرا خود نیست یارائے سوال آخر چہ می گوئی — اگر پرسد گناہ من کسے روزِ سوال از تو

مجھ میں خود تو تجھ سے پوچھنے کا یارا نہیں ہے لیکن اگر کوئی حشر کے دن میرا گناہ تجھ سے پوچھے کہ میں نے کیا قصور کیا تھا تو تیرے پاس اس کا کیا جواب ہوگا،

چہ عجب اگر نسوزد دلِ کس ز آہِ سردم — نرسیدہ ام بجائے کہ کسے رسد بدردم

اگر میری آہ سرد سے کسی کے دل میں سوز نہیں پیدا ہوتا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، میں ابھی اس مقام پر نہیں پہنچا ہوں کہ دوسرا میرے درد کا اندازہ کر سکے، یعنی میری آہ کی نارسائی خود اس کی خامی کا نتیجہ ہے،

میر حیدی: دریں بہار نشد فرصت آنقدر ما را — کہ ہم ترانۂ بلبل کنیم مینا را

اس بہار میں اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ مینا کو بلبل کا ہم ترانہ بنا سکوں یعنی شراب پی سکوں، یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اس دنیا میں اس کا موقع ہی نہیں مل سکا کہ اس سے لطف و لذت اٹھا سکتا،

از رہ نمیرود بوفائے کسے کہ میرس — ایں دل کہ آشنائے قدیم جفائے تست

یہ دل جو تیری جفاؤں کا مدتوں سے عادی ہے، دوسروں کی وفا سے بھی اپنی راہ سے نہیں ہٹتا یعنی تیری جفائیں بھی اس کے لیے دوسروں کی وفا سے زیادہ خوشگوار ہیں،

با آنکہ صرف شد ہمہ عمرم در انتظار — آگہ نیم ہنوز کہ چشمم براہِ کیست

باوجودیکہ میری ساری عمر انتظار میں گذر گئی، اس کے باوجود مجھکو معلوم نہ ہو سکا کہ میری آنکھوں کو کس کا انتظار ہے،

با تو گر دعویِ خونم بگواہ انجامد — نیست ممکن کہ برائے تو صد ایماں نرود

اگر گواہوں کی شہادت سے میرے خون کا دعویٰ تجھ پر ثابت ہو سکتا ہے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ

تیرے لیے سیکڑوں ایمان نہ چلے جائیں یعنی کوئی بھی تری خاطر سے سچی گواہی دینے کے لیے تیار نہ ہوگا اور اپنا ایمان برباد کرے گا۔

انصاف تو اے محنتِ ہجراں بکجا رفت   ہرچند گرانجانیِ ما تاب تو دارد

ہجر کی کلفتوں سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ اگرچہ میری سخت جانی تجھکو برداشت کرلیتی ہے لیکن تیرا انصاف کہاں چلاگیا، تجھکو کیوں رحم نہیں آتا،

صیادِ ما بنائے ستم تازہ کردہ است   مرغیکہ پرشکستہ شود آزاد می کند

صیاد نے یہ نیا طرز ستم ایجاد کیا ہے کہ جو مرغ پرشکستہ ہوجاتا ہے اس کو رہا کردیتا ہے اب وہ غریب کس طرح اڑ کر جائے،

ہر روزِ حیاتم شب صد گونہ الم بود   ایں عمر نبود آفت آرام عدم بود

میری زندگی کا ہر دن سیکڑوں قسم کے غم والم کی رات تھا، اس لیے یہ زندگی نہ تھی، بلکہ عدم کے آرام کے لیے بھی آفت تھی۔

افسوس کہ شد آئینہ خیرہ نگاہاں   روئے کہ نگہ کردنش از دور ستم بود

جس لطیف چہرہ پر دور سے بھی نگاہ ڈالنا ظلم تھا، افسوس کہ وہ بے بصر رقیبوں کا آئینہ بن گیا،

برقع بر انگندہ برد ناز بباغش   تا نکہتِ گل بیختہ آید بدماغش

وہ باغ میں ناز سے اس لیے نقاب ڈالکر جاتا ہے کہ پھولوں کی خوشبو بھی چھنکر اس کے دماغ میں آئے، یعنی اس کی نزاکت فراج خوشبو کے بھپکے کی بھی متحمل نہیں ہے،

کم طالعی نگر کہ من و یار چوں دو چشم   ہمسایہ ایم و خانہ ہم را ندیدہ ایم

میری یہ بدنصیبی بھی قابل دید ہے کہ میں اور محبوب دونوں آنکھوں کی طرح ایک دوسرے کے

بالکل قریب ہیں، اس کے باوجود ایک دوسرے کا گھر نہیں دیکھ سکتے اور محبت کی قربت کے باوجود میری آنکھیں نظارۂ جمالی سے محروم ہیں،

از طرز وعدہ یافتم اے بیوفا کہ تو   می آئی آں زماں کہ نہ آئی بکار من

مجھکو تیرے وعدے کے طرز ہی سے، اندازہ ہوگیا تھا کہ تو اس وقت میرے پاس آئے گا جب میرے کام نہ آسکے گا یعنی میری موت کے بعد،

عشق من کرد ترا شہرہ وحسن تو مرا   ہر دو رسوائے ہم از چہ تو تنہا رنجی

میرے عشق نے تجھے شہرت دی اور تیرے حسن نے مجھکو، ہم دونوں رسوائی میں برابر کے شریک ہیں، اس لیے تو تنہا مجھ سے کیوں رنجیدہ ہے،

ہرکس نظر کند بتو عاشق گماں کنی   بے آنکہ یک رہش بجفا امتحاں کنی

جس کی نظر بھی تجھ پر پڑجاتی ہے اس کو تو جفا سے امتحاں کیے بغیر عاشق سمجھ لیتا ہے، عشق کا اصلی امتحان تو جفا ہے،

از سیر باغ بے تو چہ دل واکند کسے   با چشم منتظر چہ تماشا کند کسے

تیرے بغیر باغ کی سیر سے دل کس طرح کھل سکتا ہے، منتظر آنکھوں کے ساتھ کیا تماشا کیا جاسکتا ہے،

ملا صبائی: از شرم ابروان مہِ من ہلال عید   خود را چناں نمود کہ کس دید کس ندید

عید کا چاند کسی کو نظر آتا ہے کسی کو نہیں، اس سے فائدہ اٹھاکر کہتا ہے کہ میرے چاند یعنی معشوق کے ابرووں کی شرم سے عید کے چاند کو کھل کر سامنے آنے کی ہمت نہیں پڑتی اور وہ اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی دیکھ پاتا ہے کوئی نہیں دیکھ پاتا۔

ملا محمد صوفی: چہ سود ازینکہ عتاب تو خندہ آمیز است   کہ زہر کارگر است ارچہ در شکر باشد

اس سے کیا حاصل کہ تیرے عتاب میں ہنسی کی آمیزش بھی ہے، زہر خواہ شکر میں ملا ہوا ہو اپنا کام
کر جاتا ہے، اس لیے ہنسی میں بھی ترے عتاب کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔

صبوحی تبریزی: از رشک کہ سوزم ز کہ پنہا کنمت ہائے   در ہیچ دلے نیست کہ جائے تو نہ باشد
میں کس کس کے رشک میں جلوں اور کس کس سے تجھکو چھپاؤں، کوئی دل بھی تو ایسا نہیں ہے
جس میں تیری یاد نہ ہو

طرفہ حالیست کہ عاشق شب ہجراں دارد   خواب ناکردن و صد خواب پریشاں دیدن
شب ہجراں میں عاشق کا حال بھی عجیب طرفہ تماشا ہے، اس کو نیند بھی نہیں آتی، پھر بھی
سیکڑوں پریشان خواب دیکھتا ہے،

غیور ہمدانی: خوش حال آنکہ ترا دید و جاں سپرد   آگہ نہ شد کہ ہجر کدام و وصال چیست
سب سے خوش نصیب وہ ہے جس نے تجھکو دیکھتے ہی جان دیدی، نہ ہجر سے واقف ہوا
نہ وصال سے،

فریاد از آں لحظہ کہ دردِ دلم آں شوخ   پرسد ز من و قوتِ گفتار نہ باشد
وہ وقت بھی کیسی بے بسی کا ہو کہ محبوب میرا درد دل پوچھے اور مجھ میں گفتار کی طاقت
باقی نہ رہے کہ بتا سکوں۔

چو می بینم کسے از کوئے او دلشاد می آید   فریبے کز تو اول خوردہ بودم یاد می آید
جب میں کسی کو اس کے کوچہ سے خوش دل آتا دیکھتا ہوں تو مجھے وہ دھوکا یاد آجاتا ہے جو
تجھ سے پہلی مرتبہ کھایا تھا کہ آئندہ اس فریب خوردہ کا بھی وہی انجام ہوگا۔

چو بر خیزد ز خواب ناز و بیند سوئے خود رویم   بہانہ چشم مالیدن کند تا ننگرد سویم
جب وہ خواب ناز سے اٹھتا ہے اور اپنی طرف میرا رخ دیکھتا ہے تو آنکھیں ملنے لگتا ہے تاکہ

مجھ پر نگاہ نہ ڈالنے کا بہانہ مل جائے، سونے کے بعد کسل دور کرنے کے لیے عموماً سونے والا
آنکھیں ملتا ہے۔

چہ حیاست اینکہ گاہے اگرم ز حال پرسی   بہزار رنگ گردی ز بصد انفعال پرسی
یہ کونسی شرم ہے کہ اگر کبھی میرا حال بھی پوچھتا ہے تو ہزاروں رنگ بدلتا اور بڑی شرم
و ندامت سے پوچھتا ہے، دوسرے مصرعے میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ ایسی لطیف
ہے کہ اس کی تشریح نہیں ہو سکتی،

ضیاء الدین صابری:-
ز نازاست اگر حرفش بلب دیر آشنا گردد   سخن را دل نمی خواہد کز آں لبہا جدا گردد
معشوق کی کم سخنی نازکی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ الفاظ اس کے لبوں کی لذت و
حلاوت کی وجہ سے اس سے جدا ہونا نہیں چاہتے، اس لیے بہت دیر میں نکلتے ہیں

آقا طاہر: جلوۂ زلف شاہدے برد دل رمیدہ را   پے بہ کجا برد کسے مرغ بشب پریدہ را
ایک حسین کی زلف کا جلوہ میرے دل کو جھپٹ لے گیا ہے، اس کا ملنا اس لیے دشوار
ہے کہ رات کی تاریکی میں جو چڑیا اڑ جائے اس کو پکڑا نہیں جا سکتا، اس لیے اسکی سیاہ
زلفوں کے جلوہ میں گم شدہ دل بھی نہیں مل سکتا،

طالب آملی: من و شوخے کہ استیلائے حسنش در صف محشر   شکایت شکر سازد بر زباں داد خواہاں را
میرا سابقہ ایسے شوخ معشوق سے ہے کہ اس کے حسن کا وفور و غلبہ صف محشر
میں داد خواہوں کی شکایت کو شکر سے بدل دیتا ہے، یعنی داد خواہ اس کے حسن
کے اثر سے اس کی شکایت کرنے کے بجائے اس کا شکریہ ادا کرنے پر مجبور ہو جاتے
ہیں، اس لیے محشر میں بھی داد خواہی کی امید نہیں۔

نومیدی از وصال تو طاقت گداز بود صد جا گرہ زدیم امید بریدہ را

ترے وصال سے ناامیدی بڑی صبر آزما اور تاب و تواں ختم کرنے والی تھی اس لیے میں نے ٹوٹی ہوئی امیدوں میں سیکڑوں جگہ گرہ لگائی ہے، تاکہ اس کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے، یعنی ناامیدی میں بھی امید قائم رکھی ہے۔

عشق را بر سر بالیں من آرید بعجز کیں طبیبیست کہ مشہور بہ یمن قدم است

عشق کی منت سماجت کرکے کسی طرح میرے سرہانے لے آؤ کیونکہ عشق کا طبیب مبارک قدمی کے لیے مشہور ہے اس کے دست شفا سے شفا ہو سکتی ہے،

چوں شکر آں کنیم کہ بر بیدلان شوق جور تو ہمچو لطف خدا کم نمی شود

اس لطف و کرم کا شکر کس طرح ادا کروں کہ محبت کے ماروں پر تیرا جور خدا کے لطف عام کی طرح ہے، جو کم نہیں ہوتا، اور تیرا جور و ظلم بھی لطف و کرم سے کم نہیں، اس لیے خدا کے لطف کی طرح تیرے لطف کا شکریہ کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے،

بے طراوت ہمچو برگ سبزۂ بے شبنم است گوشۂ دامان مژگانے کہ اشک آلودہ نیست

جو مژگاں اشک آلودہ نہیں ہے وہ اس سبزہ کی طرح بے طراوت و تازگی ہے جس پر شبنم نہ پڑی ہو، یعنی مژگاں کا حسن غم محبوب میں رونے ہی میں ہے،

با صد کرشمہ آں بت بدست می رود خود می کند خرام و خود از دست می رود

وہ بدمست بت سیکڑوں کرشموں اور ناز سے اس طرح چل رہا ہے کہ خود ہی خوشخرامی کرتا ہے اور خود ہی قابو سے باہر ہو جاتا ہے، مصرعہ ثانی کی کیفیت کی

تشریح نہیں کی جا سکتی۔

مردم ز رشک چند ببینم کہ جام مے لب بر لبش گذارد و قالب تہی کند

میں رشک میں مرا جاتا ہوں، کب تک اس منظر کو دیکھوں کہ جام شراب معشوق کے لبوں پر لب رکھکر قالب خالی کر دیتا ہے، کاش اسی طرح میں بھی اسکے لبوں پر لب رکھکر جان دے دیتا،

خزاں رسید و بوئے بہار رفتہ ہنوز ذخیرہائے جنوں در دماغ دل دارم

خزاں کا موسم آگیا، لیکن بہار رفتہ کی خوشبو کے اثر سے میرے دل کے دماغ میں اب بھی جنون کا بڑا ذخیرہ جمع ہے، یعنی خزاں میں بھی بہار کے اثرات باقی ہیں،

ع پیری شباب ہے، جو تمنا جواں رہے

طبی بیتانی: تنہا بدیدہ نتواں داد گریہ داد چوں ابر میتواں ہمہ اعضا گریستن

تنہا آنکھوں سے رونے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا، ابر کی طرح سارے اعضا کو رونا چاہیے، اس وقت رونے کا پورا حق ادا ہوگا۔

طوفی تبریزی:-

بدشواری از وقطع نظر کردم ولے ہرگہ بخاطر می رسد بے اختیارم گریہ می آید

میں نے بڑی دشواری سے اس کا خیال چھوڑا ہے، مگر اب بھی جب اس کی یاد آتی ہے تو بے اختیار رونا آجاتا ہے۔

مرزا طاہر: سرتا بقدم رفتہ بتاراج نگاہے از چشم و دلم ماندہ ہمیں اشکے و آہے

اس کی نگاہ نے سر سے پاؤں تک جو کچھ تھا سب لوٹ لیا، میرے پاس آنکھ اور

دل کی نشانی صرف آنسو اور آہ رہ گئے ،

طاہر عطا: از فریبِ باغباں غافل مشو اے عندلیب ۔۔۔ پیش ازیں ہم دریں باغ آشیانے داشتم

بلبل سے کہتا ہے کہ باغبان کے فریب سے کسی وقت بھی غافل نہ ہو، اس باغ میں میرا بھی آشیاں رہ چکا ہے، اس لیے میں اس کے فریب سے خوب واقف ہوں ،

محمد علی طالب طاہر:۔

من آں صیدم کہ خوں خویشتن را در قفس ریزم ۔۔۔ برد گر پیشِ صیادم کسے نام رہائی را

میں وہ صید ہوں کہ اگر کوئی شخص میرے صیاد کے سامنے رہائی کا نام لیتا ہے تو میں قفس میں اپنا خون بہا دیتا ہوں، یعنی اسیری کا اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ آزادی کے نام سے جان دینے پر آمادہ ہو جاتا ہوں، ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رہائی کے نام سے آزادی کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے، اور میں جان دینے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہوں ۔

قاطعی قزوینی طغرا: نمیدہم بہ نگہ رخصتِ نظارۂ یار ۔۔۔ دریں زمانہ بچشم خود اعتمادے نیست

اس زمانہ میں اپنی آنکھوں پر بھی اعتماد نہیں رہا، اس لیے نگاہ کو محبوب کے نظارۂ جمال کی اجازت نہیں دیتا کہ کہیں وہ بھی رقیب نہ بنجائے ۔

نیامدی کہ مبادا بمیرم از شادی ۔۔۔ بیا کہ مرگ بہ از انتظار می باشد

تو اس خوف سے نہیں آتا کہ میں خوشی سے مر نہ جاؤں، لیکن موت انتظار کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے، اس لیے تجھے آجانا چاہیے کہ انتظار کی مصیبت سے مجھے نجات ملے ۔

دکانِ گل کشاید چوں نقاب از چہرہ برگیرد ۔۔۔ گرہ در کارِ سرو افتد چو دستے بر کمر دارد

محبوب جب چہرہ سے نقاب اٹھاتا ہے تو پھولوں کی دوکان کھول دیتا ہے اور جب کمر پر ہاتھ رکھتا ہے تو سرو کے کام میں گرہ پڑ جاتی ہے ۔

(باقی)

مطبوعاتِ جدیدہ

رسالوں کے خاص نمبر

زندگی مسلم پرسنل لا نمبر مرتبہ مولانا سید احمد قادری، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۰، قیمت ۳ روپیہ دفتر ماہنامہ زندگی، رام پور،

مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور ملک میں مشترکہ سول کوڈ جاری کیے جانے کی مخالفت میں بہت سے مفید مضامین اور اخباروں اور رسالوں کے خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں، زندگی کا یہ خاص شمارہ اسی سلسلہ کی ایک مفید اور قابل تحسین کوشش ہے، اس کے شروع کے تین مضامین میں پرسنل لا کی دینی، ملی، اور تہذیبی حیثیتوں سے اہمیت بیان کی گئی ہے، اور اس میں ترمیم و تنسیخ کے خطرات ظاہر کیے ہیں، فاضل مرتب نے "یتیم پوتے کی وراثت"، "مرد کا حق طلاق" اور "تعدد ازدواج" سے متعلق اہم اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے، اور مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں جد و جہد کے لیے بعض مفید مشورے دیے ہیں، اور شرعی نظام قضا کی ضرورت واضح کی ہے دو مضامین میں مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے حامیوں کے رجحانات نقل کر کے ان کا جواب دیا گیا ہے، ایک مضمون میں شریعت اور عائلی قوانین کے بارہ میں مستشرقین اور مسلمان تجدد پسند طبقہ کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے، اور عائلی قوانین سے متعلق بعض اہم ایکٹوں کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر مفید اور سنجیدہ مضامین پر مشتمل اور موافق و مخالف دونوں کے مطالعہ کے لائق ہے، اس میں جو اہم مضامین شامل نہیں

ہو سکے ہیں ان کو آئندہ دوسرے خاص نمبر میں شائع کیا جائے گا۔

جامعہ

سرسید کی معنویت موجودہ دور میں } مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی، متوسط تقطیع
کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۸۸،
قیمت ؎ پتہ: رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

رسالہ جامعہ نے یہ خاص نمبر موجودہ دور میں سرسید کی معنویت و اہمیت کو واضح کرنے کے لیے شائع کیا ہے، یہ چھ مضامین پر مشتمل ہے، شروع کے تینوں مضامین جو پروفیسر مجیب، ضیاء الحسن فاروقی اور آل احمد سرور کے قلم سے ہیں، اس سمینار میں پڑھے گئے تھے، جو جنوری ۷۳ء میں مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی طرف سے منعقد ہوا تھا، ان میں فاضل مدیر کا مقالہ خاصہ ہے، اس میں مذہب، عبادت، تفسیر قرآن، حدیث اور اجتہاد و تقلید وغیرہ کے بارہ میں سرسید کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے، گو فاضل مقالہ نگار کا یہ خیال صحیح ہے کہ "احادیث سے متعلق انھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جس سے معاذ اللہ اسلام کی بیخ کنی ہوتی ہے" مگر یہ سرسید کے نقطۂ نظر کی صحت کی دلیل نہیں، کیونکہ خود مقالہ نگار نے بھی "مذہبی عقائد اور قرآن کے محکمات و متشابہات میں ان کی اس قدر غیر ضروری کد و کاوش کو کھینچ تان کر انھیں علوم جدیدہ کے مسائل کے مطابق کر دکھایا جائے کو غیر علمی اور بہت بڑی کمزوری بتایا ہے"، ٹھیک یہی بات حدیثوں کی توجیہ اور ان کے رد و قبول میں بھی ان کے نقطۂ نظر پر چسپاں ہوتی ہے، سرسید کا محدثین پر یہ الزام بھی صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے درایت سے کام ہی نہیں لیا ہے، درایت تو فن حدیث کا ایک مسلمہ اصول ہے، جناب رفیع الدین کا مضمون جامع ہے، اس میں سرسید کے تعلیمی نظریات تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں، دوسرے مضامین بھی لائق مطالعہ ہیں، گو ان کی بعض باتیں محل نظر ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر سرسید کے افکار و تصورات کو سمجھنے کے لیے مفید ہے۔

دو ماہی شیراز سمینار نمبر

- مرتبہ جناب محمد یوسف ٹینگ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۰، قیمت سالانہ ؎ فی کاپی ؎ پتہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، شہید گنج، سری نگر۔

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز نے "جدیدیت کے ادبی رجحانات اور اردو، کشمیری اور لداخی زبانوں پر اس کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے مارچ ۷۲ء میں ایک سمینار منعقد کیا تھا، اس میں جن ادیبوں نے شرکت کی تھی، ان میں جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر محمد حسن، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر شکیل الرحمن، عبد الرحمن راہی اور خود فاضل مرتب کے نام قابل ذکر ہیں، یہ نمبر اس سمینار میں پڑھے جانے والے دس مضامین پر مشتمل ہے، بیشتر مضامین میں اردو زبان میں جدیدیت اور اسکے رجحان پر بحث کی گئی ہے، تین مضامین میں کشمیری شاعری، افسانہ اور ڈرامہ کا اور ایک میں "نیا لداخی ادب" کا جائزہ لیا گیا ہے، آخر میں سمینار کی مفصل روداد ہے، ڈاکٹر شکیل الرحمن کا مضمون "تنقید کی نئی جہتیں" زیادہ مفصل ہے، مگر اس میں متوازن اور حقیقت پسندانہ باتوں کے ساتھ کچھ غیر متوازن اور انتہا پسندانہ باتیں بھی آگئی ہیں، دوسرے مضامین میں بھی معتدل اور غیر معتدل دونوں طرح کے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، اور جدیدیت کی ماہیت و حقیقت کے بارہ میں اس قدر مختلف اور متضاد باتیں کہی گئی ہیں کہ اسکا کوئی واضح اور متعین مفہوم سامنے نہیں آتا، جس کا سمینار کے رپورٹر نے بھی اعتراف کیا ہے، تاہم جدیدیت اور ادب میں نئے افکار و رجحانات کے بارہ میں ادیبوں اور ناقدین نے الگ الگ خیالات پیش کیے ہیں، ادبی و علمی مسائل کی تفہیم و جائزے کے لیے اس طرح کے سمینار مفید ہیں، اس حیثیت سے اکیڈمی کی یہ کوشش لائق تحسین ہے۔

نشان منزل خاص نمبر

- مرتبہ مولانا حبیب ریحان ندوی، بڑا اخباری سائز، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۵، قیمت ؎ پتہ دفتر نشان منزل، تاج المساجد بھوپال۔

نشان منزل دار العلوم تاج المساجد بھوپال کا پندرہ روزہ اصلاحی و دینی جریدہ ہے، اس کا ہر سال ایک خاص نمبر بھی شائع ہوتا ہے، ۷۰ء کا خاص نمبر بھوپال کے مشہور عالم ربانی اور عارف باللہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجددی کی یادگار میں شائع کیا گیا ہے، اس میں ان کے سوانح وحالات، فضائل وکمالات، سیرت وکردار اور شریعت وطریقت میں جامعیت وغیرہ سے متعلق متنوع مضامین ہیں، "اصفات واحلام" کے عنوان سے خود حضرت شاہ صاحب کا ایک بیش قیمت رسالہ درج ہے، اکابر میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا، مولانا عبد الماجد دریابادی مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی کے مضامین نے اس نمبر کو زیادہ اہم بنادیا ہے، مولانا محمد عمران خاں کے دونوں مضامین "نادر تشخیص برمحل تجویز" اور "حضرت صاحب کا سفر آخرت" بڑے اثر انگیز ہیں، صاحبزادہ مولانا محمد سعید مجددی اور لائق مرتب کے مضامین بھی خاصے ہیں، شعراء نے منظوم ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے، ایک مضمون میں حضرت کی وفات کے بارہ میں رسائل وجرائد کے تاثرات نقل کیے گئے ہیں، آخر میں صاحبزادہ محترم اور مولانا محمد عمران کے نام کے تعزیتی خطوط درج ہیں، ان سے حضرت کی عظمت ومقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس دور کے ایک نامور بزرگ کی زندگی کا بڑا سبق آموز اور ایمان افروز مرقع ہے۔

تجلی ڈاک نمبر۔ اڈیٹر مولانا عامر عثمانی متوسط سائز کاغذ معمولی، کتابت طباعت بہتر، صفحات ۱۱۴ قیمت ۶ پتہ ماہنامہ تجلی، دیوبند۔

ماہنامہ تجلی اکثر خاص نمبر شائع کرتا ہے، اس کے عام شماروں میں "تجلی کی ڈاک" کے زیر عنوان قارئین کے مختلف النوع سوالات کے جواب درج ہوتے ہیں، اس نمبر کا تقریباً تہائی حصہ استفسارات کے جواب پر مشتمل ہے، اور بقیہ حصے میں تجلی کے بعض مستقل عنوانات آغاز سخن، کھرے کھوٹے اور مزاحیہ حصہ "مسجد سے میخانے تک" کے علاوہ بعض دیگر مضامین نظم ونثر بھی دیے گئے ہیں، استفسارات کے جواب پر از معلومات ہیں لیکن ان میں کہیں کہیں طوالت اور لہجہ تیز ہوگیا ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۱　ماہ صفر المظفر ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۳ء　عدد ۳

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

مطبوعات جدیدہ